SEPTEMBER
2022

جدید ادب کا آفاقی ریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

اُردو
بے ادبی کی مختصر تاریخ
امجد محمود چشتی

...ہوئی پتھر مری زبان

امتیازنامہ
(تین نسلوں کی داستان)

شجاعت علی راہی
بلیک باکس
(خودنوشت)

مقام

آیا جو منہ میں جس کے ، مرے منہ پہ کہہ گیا
کچھ حیثیت مری ، نہ مرا کچھ وقار تھا
پھر یہ غبار کیوں پسِ اظہار رہ گیا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ Karachi: (021) 34541301-7 ■ Lahore: (042) 36363300-7
■ Sialkot: (052) 3554301-6 ■ Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
■ Faisalabad: (041) 8542924 ■ Peshawar: (091) 5606565 ■ Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - ستمبر 2022 - شمارہ نمبر: 9

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: قائم نقوی، اختر شمار

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک $100 پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 92-42-37513000-3 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر و پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر زونل ریکسائل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	ضیا الدین نعیم، اکرم سحر فاراتی، اعجاز دانش	7 تا 9
2	نعت	نسیم سحر، خاور اعجاز، اکرم ناصر، تابش کمال، محمد یٰسین قمر محمد انیس انصاری، سرور حسین نقشبندی، حسنین مظہری	10 تا 17
3	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	18 تا 22
4	مضامین	منظر حسین اختر، خورشید ربانی، محمد شفیق، ہارون الرشید ظفر معین بلے جعفری، شاعر علی شاعر، شاہدہ دلاور شاہ فیصل زمان چشتی، سیدہ آمنہ ریاض، کلیم خارجی، محمد ظہیر بدر عادل سعید قریشی، یوسف عرفان، جام سجاد حسین، اعجاز رضوی	23 تا 96
5	شاعرِ امروز	قمر عباس قمر، زہرا اقرار (شاہد ماکلی)	97 تا 101
6	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	102 تا 110
7	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، سلطان سکون، انور شعور، نسیم سحر یعقوب پرواز، صفدر صدیق رضی، خاور اعجاز، باقی احمد پوری محمد انیس انصاری، اکرم ناصر، اقبال سروبہ، عقیل رحمانی، احمد جلیل آغا نثار، مسعود احمد، راحت سرحدی، خالد معین، طالب انصاری حسنین سحر، ہارون الرشید، ذکی طارق، افتخار شاہد، ہمایوں پرویز شاہد	111 تا 187

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
7	غزلیں	عبدالقادر تاباں، نذر عابد، عزیز عادل، مقصود جعفری، حریم حیدر ریاض ندیم نیازی، رخشندہ نوید، شاہد ماکلی، وسیم جبران فیض رسول فیضان، مرزا آصف رسول، ثمینہ سید، ارشد محمود ارشد سعدیہ بشیر، اشرف کمال، اکرم جاذب، شبہ طراز، اعجاز روشن اعجاز دانش، طلعت شبیر، کاشف رحمان، ثقلین جعفری، عقیل شاہ محمود کیفی، عاصم اعجاز، علی رضا بلوچ، علی آرش، امتیاز انجم جیا قریشی، فرخ محمود، سرفراز عارض، رفعت وحید عامر عباس ناصر اعوان، عمر قیاز قائل، نائیلہ راٹھور عدیل عباس عادل، سید ضیا حسین، اکمل حنیف، شہاب اللہ شہاب احمد محمود، گل جہان، قاسم حیات، میتھیو محسن، مزمل ادریس حسیب الحسن، کوکی گل، منیر جعفری، دانیال احمد زمان شعیب عدن، قمروش عاطر عظمی، شفقت حیات شفق رداحاصل خلوص، فریدہ خانم، رانا محمد شاہد، مہر علی، اعجاز رضوی	111 تا 187
8	تراجم	محمد احمد، حمزہ حسن شیخ	188 تا 196
9	افسانے	ابدال بیلا، محمد افتخار شفیع، نور کمال شاہ، صبا ممتاز بانو	197 تا 216
10	مائیکروفکشن	عاصم بخاری، عمار نعیمی	217 تا 218
11	نظمیں	امجد اسلام امجد، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر گلزار بخاری، طلعت شبیر، ریاض ندیم نیازی، علمدار حسین دانش عزیز، ظہور چوہان، نائلہ راٹھور، راجہ عبدالقیوم نیاز جیراجپوری، زعیم رشید، امجد بابر، عاطف جاوید عاطف	219 تا 236
12	خطوط	آصف ثاقب، جمیل یوسف، نسیم سحر طالب انصاری، اشرف کمال، رانا محمد شاہد	237 تا 241

حمد و تشکر

تو ربِ ذوالجلال و ذی حشم ہے !
بڑائی تیری پل پل پر رقم ہے

تری تعریف کا کیا حق ادا ہو
سمندر بھی یہاں ، قطرے سے کم ہے

کسی سے مانگنا ، تیرے علاوہ
سمجھ کا پھیر ہے خود پر ستم ہے

تری شفقت ہے مجھ عاجز پہ یارب
یہ جو اِک چین سا دل کو بہم ہے!

نہیں پاتی جو مجھ پر یاس غلبہ
سراسر یہ ترا فضل و کرم ہے

میں ورنہ کیا ہوں؟ خود کو جانتا ہوں
عنایت سے تری قائم بھرم ہے !

اِطاعت پر تری قائم رہوں میں
مِرے اللہ ! جب تک دم میں دم ہے

نعیم اپنی یہی ہے سرفرازی
حضورِ ربّ سرِ تسلیم خم ہے !!

ضیاالدین نعیم

حمد

پھول پتے ٹہنیاں خوشبو کے دھارے رکھ دیئے
کس نے اِک ذرّے میں یہ سامان سارے رکھ دیئے

کر رہا ہے کون پس منظر میں یہ گُل کاریاں
کس نے نظروں میں مناظر پیارے پیارے رکھ دیئے

انبیاء کو حق نے بخشے چیدہ چیدہ معجزے
مصطفیٰ کی ذات میں سارے کے سارے رکھ دیئے

رکھ دیئے آنکھوں میں چشمے اور پھر چشموں کے گرد
خالقِ مطلق نے پلکوں کے کنارے رکھ دیئے

ماں کو بچّے سے نوازا ہے تو اس سے پیشتر
دودھ کے چھاتی میں اُس کی گرم دھارے رکھ دیئے

پیار ستر ماؤں کا ، شانِ کریمی ، رحمتیں
بے سہاروں کے لئے کیا کیا سہارے رکھ دیئے

کوہساروں کو عطا فرما دیئے ہیں آبشار
خشک صحراؤں میں دریاؤں کے دھارے رکھ دیئے

اُس نے جب چاہا زمیں کو بخش دیں ہریالیاں
اور جب چاہا سبھی منظر اُتارے رکھ دیئے

اکرم سحر فارانی

حمد

زباں پر ہو شام و سحر اللہ اللہ
ہو آباد دل کا نگر اللہ اللہ

الٰہی مجھے اپنی الفت عطا کر
کریں ورد قلب و نظر اللہ اللہ

ترے حکم سے خالقِ ہر دو عالم
فروزاں ہیں شمس و قمر اللہ اللہ

جو دل سے سنے اس کی دنیا بدل دے
ہے قرآں ترا پر اثر اللہ اللہ

ترا ذکر ہی حاصلِ زندگی ہے
لبوں پر ہے بارِ دگر اللہ اللہ

اسی کی حکومت یہاں بھی وہاں بھی
اِدھر اللہ اللہ اُدھر اللہ اللہ

دمکتے ہیں اس کی عنایت سے دانش
مرے حرف مثلِ گہر اللہ اللہ

اعجاز دانش

نعتؐ

عطا مُجھ پہ ہے دم بہ دم ، بے حساب
نبیؐ کا ہے مُجھ پر کرم بے حساب

جو ہے میری آنکھوں میں نَم بے حساب
کرم مجھ پہ شاہِ اُممؐ ، بے حساب!

جو مَیں نعت لکھنے لگا آپؐ کی
ہوئے لفظ مجھ کو بہم بے حساب

مگر مدحتیں کب بیاں ہو سکیں !
بیاں چاہے کر لے قلم بے حساب

پڑھے جا رہا ہوں درود و سلام
قدم در قدم در قدم بے حساب

ہمیں کیوں نہ ہو اُس سے نسبت عزیز
وُہ ہستی کہ ہے محترم بے حساب

جو نوکِ قلم نعت لکھنے لگے
تو ہوتا ہے خم یہ قلم بے حساب

انہیںؐ یاد کرتے ہی چین آ گیا
گھنیری تھی شامِ الم بے حساب

لکھے جا رہی ہے درود و سلام
نسیمِ سحر ، چشمِ نم بے حساب!

نسیمِ سحر

نعتؐ

ذرّۂ شوق سے خورشیدِ جہاں ہو جاؤں
اِک نظر مجھ پہ پڑے، مَیں بھی درخشاں ہو جاؤں

حرفِ بے صوت بنا چومتا ہُوں جالیوں کو
اذنِ اظہار مِلے تو لبِ امکاں ہو جاؤں

کاش چھو جائے مجھے بادِ مدینہ اِک بار
جسمِ خاکی نہ رہوں، روحِ رواں ہو جاؤں

آپؐ کے در کے سوا کوئی نہیں ہے کہ جہاں
دو گھڑی بیٹھ کے افلاک نشاں ہو جاؤں

چشمِ ہستی میں رہوں یا نہ رہوں مَیں لیکن
آپؐ کے چاہنے والوں میں نمایاں ہو جاؤں

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رِفعت لکھی

نعتؐ

عنایت پر بھروسہ ہے شفاعت پر گزارہ ہے
وگرنہ علم ہے ہم کو عمل جتنا ہمارا ہے

ہر اک مشکل سے نکلے ہیں اسی کے ہم بھروسے پر
وہی اپنا سہارا تھا وہی اپنا سہارا ہے

وہ جس نے لے لیا ہے وعدہ امت بخشوانے کا
مجھے میرے خدا نے اس کی امت میں اتارا ہے

سمندر سے بھلا تشبیہ دوں کیا ان کی رحمت کو
ہے رحمت بیکنار ان کی سمندر کا کنارا ہے

اگر دل میں اٹھے تو شکرِ ربِ کبریا کیجے
کہ حب سیدِ کونین بخشش کا اشارہ ہے

محمد کی محبت کا یہ سب فیضان ہے اکرم
خدا کا شکر کہ اب اوج پر اپنا ستارہ ہے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے زیبِ زینِ توسنِ زرّیں زمام! رُک
گھبرا کے چھپ نہ جائیں ستارہ سخن تمام

نعتؐ

مہک رہے ہیں بہر سو جنابؐ اور گلاب
بہم رہیں گے رسالتؐ مآب اور گلاب

کبھی جدا نہیں ہوتے ہیں لفظ اور خوشبو
ہمارے پاس ہے اپنا نصاب اور گلاب

حضورؐ پاک کی آمد پہ سرخوشی دیکھو
کھلا ہوا ہے مودت کا باب اور گلاب

خوشی سے پھولتے ہیں آسمان اور زمین
سو مسکراتے ہیں سارے شہاب اور گلاب

حضور آپؐ کی خدمت میں رکھ دیئے میں نے
یہ اپنے تازہ ترین چند خواب اور گلاب

ملا ہے آلِ محمدؐ سے اذن یہ تابش
یہاں پہ لائے مجھے بوترابؓ اور گلاب

وہ نکہتیں ہیں کہ دریا سے جا نہیں سکتیں
رُکے ہوئے ہیں کناروں پہ آب اور گلاب

نہیں ہے کاسۂ درویش میں کچھ اس کے سوا
بس ایک نعت کی تازہ کتاب اور گلاب

انھیں گلابوں میں دیکھا تو بول اُٹھا یہ دل
ملاحظہ ہوں اکٹھے گلاب اور گلاب

یہ فیضِ شاہِؐ مدینہ ہے جو مہکتے ہیں
لہو میں عشقِ محمدؐ کا باب اور گلاب

میں دیکھتا تھا کہ ہیں آپؐ اور باغِ عدن
مہک اُٹھا ہے مرا سارا خواب اور گلاب

تابش کمال

نعتؐ

ہر کثافت دُھلی شبنمِ نعت سے
سوچ طاہر ہوئی شبنمِ نعت سے

روگ جتنے بھی تھے دور سارے ہوئے
ظاہری باطنی شبنمِ نعت سے

جس کی روئیدگی گویا ممکن نہ تھی
وہ کلی بھی کھلی شبنمِ نعت سے

کشتِ ذوق و عقیدت ذرا دیکھیے!
کیسے پھولی پھلی شبنمِ نعت سے

خشک و ویران تھی سر زمینِ دعا
اس میں ہے اب نمی شبنمِ نعت سے

جب سے اس پر پڑی آب و تاب کرم
ذرّہ ہے روشنی شبنمِ نعت سے

مزرعِ فکر و فن ، میری ارضِ سخن
اجلی اجلی ہوئی شبنمِ نعت سے

میرے گلزارِ نطق و نوا میں قمر
اک بہار آگئی شبنمِ نعت سے

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

آپؐ تا بہ ابد انتخابِ خُدا ، یا اَبا فاطمہؓ
پوری اِنسانیت کے لیے رہنما ، یا اَبا فاطمہؓ

آپؐ نورالہدیٰ، آپ اُمّی لقب، آپؐ تلمیذِ رب
آپؐ کی ذات سے علم کا سلسلہ ، یا اَبا فاطمہؓ

اُخروی زندگی کی طرف، دائمی روشنی کی طرف
ایک ہی راستہ ، آپؐ کا راستہ ، یا اَبا فاطمہؓ

انبیاء و رُسل منتظر آپؐ کے، مقتدی آپؐ کے
آپؐ کو جب مصلے پر لایا گیا، یا اَبا فاطمہؓ

رب نے بھی دے دیا آخری فیصلہ، برملا کہہ دیا
آپؐ کا جو کہا ، وہ ہے میرا کہا ، یا اَبا فاطمہؓ

آپؐ کے در پہ سر کو جھکائے ہوئے، منہ چھپائے ہوئے
پھر کھڑا ہے تمھارا پرانا گدا ، یا اَبا فاطمہؓ

اے انیسِ دل و جاں، جہانِ اماں مونس و مہرباں
اک کرم کی نِگہ، اک کرم کی نِگہ ، یا اَبا فاطمہؓ

محمد انیس انصاری

نعتؐ

اک طرف عجز بیانی میری
اور پھر زمزمہ خوانی میری

ذہن میں نعت کا مصرعہ اترا
ہو گئی صبح سہانی میری

آ بھی سکتا تھا غزل کی جانب
پر طبیعت نہیں مانی میری

عرض کر دینی ہے جا کر اس بار
ایک حسرت ہے پرانی میری

آپ سن لیتے ہیں آقا ورنہ
کون سنتا ہے کہانی میری

آپ کا ذکر حوالہ میرا
آپ کی نعت نشانی میری

لے کے آئی ہے ثنا کی خیرات
آج پھر اشک فشانی میری

جادۂ نعت پہ رکھتے ہی قدم
کب ٹھہرتی ہے روانی میری

خالد احمد کی زمیں میں سرور
کھل اٹھی شیریں بیانی میری

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

روزِ اول ہی سے مرہونِ کرم تیرے ہیں
ہم کہ پروردہ ہی قسّامِ نعم تیرے ہیں

بامِ امکان پہ ضوریز ثنا ہے تیری
لوحِ ادراک پہ اوصاف رقم تیرے ہیں

ہیں ضیا پاش اُنہی سے یہ مہ و مہر و نجوم
ثبت افلاک پہ جو نقشِ قدم تیرے ہیں

جاہ و حشمت سے علاقہ ہے نہ دنیا سے غرض
ہم طلبگار شہنشاہِ اُمم تیرے ہیں

مجھ کو رکھتے ہیں غمِ گردشِ دوراں سے پرے
غم جو مستور پسِ دیدۂ نم تیرے ہیں

گو کہ اعمال سے خالی ہیں ہمارے دامن
لیکن اس بات پہ نازاں ہیں کہ ہم تیرے ہیں

تیری نسبت نے کسے رکھا ہے محرومِ کرم
کیوں نہ ہم ہوں گے سزاوارِ ارم، "تیرے ہیں"

مجھ کو خوش آتی نہیں غیر کی توصیف و ثنا
تذکرے لب پہ مرے دم بہ دم تیرے ہیں

آنکھیں راہوں میں بچھائے ہوئے اے شاہِ عرب
منتظر کب سے سبھی اہلِ عجم تیرے ہیں

تجھ کو اللہ نے کچھ ایسا نوازا ہوا ہے
جتنے عالم میں ہیں اسباب کرم تیرے ہیں

شادکامی نے کیا اُن کے مقدر کا طواف
جن کے سینوں میں تڑپ تیری ہے، غم تیرے ہیں

ایک ہم ہی تو نہیں چاہنے والے تیرے
نصب اغیار کے دل میں بھی علَم تیرے ہیں

تیری رحمت اُنہیں آغوش میں لے لیتی ہے
دل سے اک بار جو کہتے ہیں کہ ہم تیرے ہیں

تھک کے گرتے نہیں وہ لوگ کسی منزل پر
حوصلے جن کو زمانے میں بہم تیرے ہیں

کیوں نہ روشن ہوں مدینے کی زمیں کے ذرے
ضوفشاں جلوے سرِ بامِ حرم تیرے ہیں

مصحفِ حق میں اٹھاتا ہے خدا جن کی قسم
اے مرے شاہ وہ انداز و شیم تیرے ہیں

مظہریؔ تجھ سے نہ مانگیں تو وہ مانگیں کس سے
کُل کا مختار ہے تُو لوح و قلم تیرے ہیں

حسنین مظہری

آپ کیوں روئے؟

یہ ایک سادہ سے گھر کا دروازہ ہے اور دروازہ بھی شاید ہے یا نہیں ہے؟ کیوں؟ اس لئے کہ نا تو اس میں کوئی دیدہ زیب چوکھٹ ہے نا ہی بیش قیمت نقش و نگار والا دروازہ ہے صرف اس میں پردہ کے لئے اک بوریا لٹکا ہوا ہے جس کے آگے تقریباً دو مرلے کا گھر ہے ہوسکتا ہے یہ پیمائش زیادہ بتا دی گئی ہو۔ (کیونکہ اس پاکیزہ اور متبرک گھر کا جو ماڈل راقم نے مدینہ شریف میں دیکھا وہ تو بہ مشکل ایک ہی مرلے کا تھا)

یہ ختم المرسلین کا گھر ہے اس کائنات ہی کے نہیں کائناتوں کے والی کا ہے کہ اس گھر کے مکیں صرف مسلمانوں ہی کے نہیں انسانیت کے محسن ہیں۔ اسی ننھے سے گھر کا مختصر سا دالان بالکل کچا ہے مگر یہ اس دور کے قیصر و کسریٰ کے بیش قیمت پکے محلوں سے کہیں افضل ہے بلکہ معاذ اللہ یہ موازنہ بھی ہم دنیا داروں ہی کے سمجھ کے لیے ہے ورنہ اس گھر کے مکیں کا ممبر عرشِ بریں ہے ان کا سائیں اس گھر کے مکیں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ اس مختصر دالان میں ایک کونہ باقی دالان سے ذرا اوپر بنا ہوا ہے اس میں عُنابی سے رنگ کی چکی پڑی ہوئی ہے جس کے پُڑے تازہ پیسے گئے جو والے آٹے سے مزین ہیں۔ اس چکی سے ذرا سا ہٹ کر کچی دیوار ہے اس کے ساتھ مٹی کا لبوترا سا بڑا گھڑا رکھا ہے تا کہ صحرائے عرب کی سخت گرمی میں اس کے اندر پانی ذرا ٹھنڈا رہے اس مٹی کے برتن کے ساتھ ہی دیوار پر ایک چٹائی لٹک رہی ہے جسے بچھا کر سرکارِ دو عالم رات کو بہت دیر تلک نوافل ادا کرتے ہیں امی جان حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رات کو اللہ کے سچے رسولؐ لمبا قیام لمبا رکوع اور لمبا سجدہ کرتے۔ آپؓ فرماتی ہیں کہ اتنا لمبا قیام ہوتا کہ پاؤں مبارک پر ورم آجاتا۔ آپؐ اتنے درد سے روتے کہ سینے سے ہنڈیا کے اُبلنے کی آواز آتی تھی۔

میں نے اس بارے پہروں سوچا بڑی لمبی راتیں اسی فکر میں گذریں کہ آپؐ میرے لئے آپ کے لئے اور ہم سب کے لئے راتوں کے پچھلے پہر بہت دیر تلک روئے۔ حق تعالیٰ شانہ سے ہمارے لئے بخشش مانگی بہت سی کتابیں راقم نے اسی بات کے بارے کھنگالی گئیں بس اک تحفکن اک شرمندگی ہی ان پہروں کا حاصل تھی:

لگتا ہے کئی راتوں سے جاگا ہے مصورؔ
تصویر کی آنکھوں سے تھکن جھانک رہی ہے

سلیمان عبداللہ ڈار

خیر خواہی کی حد ہے محبت کی حد ہے حد ہے کہ وہ ہر بندہ پراگندہ کے لئے روئے وہ خود تو بخشے بخشائے تھے بس وہ میرے لئے روئے دل نے بار بار بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہو کر التجا کی کہ آپؐ کیوں روئے۔؟ پھر میرے لئے؟ میں تو گلیوں کا روڑا کوڑا ہوں۔ بھلا کوئی کسی کا اتنا خیال بھی کیا کرتا ہے اور وہ بھی اپنے ان امتیوں کے لئے کہ جن کی غالب اکثریت کے دامن میں کوتاہیوں نادانیوں اور غفلتوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ دل نے کہا کاش میں اس سے اس مختصر سے گھر کے آس پاس ہوتا کہ کون مکاں اور آفاق جس کی چوکھٹ پر سرنگوں ہوتے ہیں۔ میں اپنے آقاؐ کے قدموں میں گر جاتا اور عرض کرتا۔ بس کریں اللہ کے سچے رسولؐ میرے ماں باپ بیوی بچے گھر بار کاروبار اور میری یہ عمر رائیگاں آپؐ پر نثار۔ آپؐ نے ہادیٔ برحق ہونے کا حق ادا ہی نہیں کیا اس سے کہیں زیادہ دلداری کی ہے۔ کاش میں وقت کو پیچھے لے جاتا پھر وہ لمحہ بن جاتا۔ وہ لمحہ کہ جس میں آپؐ میرے لئے روئے اتنی خیر خواہی تو سگے ماں باپ بہن بھائی اور جگری یار بھی نہیں کرتے جتنی آپ نے کی میری کوتاہیوں کو آپ نے ڈھانپ دیا کیسے کریم آقا ہیں آپ کہ صبر اور ضبط کا پہاڑ بھی آپ کے تحمل کے سامنے پاش پاش ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے جس گھر کا نقشہ آپ کے سامنے کھینچا اس میں ہر رات صبر کی تحمل کی رات تھی یعنی اپنی کوئی ذاتی خواہش ہی نا تھی جب سوچا اُمتؐ کے لئے ہر ہر امتی کے لئے ہی سوچا ہماری ماؤں سے نکاح بھی کیا تو امت کی سوچ میں کیا۔ حضرت جویریہؓ سے نکاح کیا تو دین متین کو کس قدر فائدہ ہوا یہ دورِ نبویؐ کے لوگ ہی جانتے ہیں حضرت جویریہؓ اپنے قبیلے کے سردار کی بیٹی تھیں آپؐ سے نکاح کے بعد صحابہ کرام نے سوچا کہ یہ قبیلہ تو حضورؐ کا سسرال ہے سب نے اس قبیلہ والوں کی عزت و توقیر کی ہر کسی نے ہدیہ دیا۔ بعض صحابہ کے پاس غربتِ دنیا کی وجہ سے کوئی ہدیہ نا تھا تو تن کی قمیض یا عبا اتار کر اپنے نومسلم بھائی کو ہدیہ کر دی اس سلوک کو دیکھ کر سینکڑوں ہزاروں کلمہ گو بن گئے کہ جسے قرآن مجید نے کہا۔ جوق در جوق اور جھنڈ کے جھنڈ لوگ دینِ حق میں داخل ہو گئے۔

آیئے اس عظیم گھر کے نقشہ کو وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے یہ ربط جہاں سے یہ رابطہ منقطع ہوا تھا۔ تو اس دیوار میں مٹی کے لمبے برتن میں پانی ہے جو کہ گرمی میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس برتن کے اوپر ایک چٹائی ہے جسے اسی برتن کے ساتھ بچھا کر یہ خاک نشیں سچے رسول عرش نشیں ہوتے ہیں۔ دعائیں کرتے ہیں اپنے خالق کے ساتھ باتیں کرتے ہیں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ سامنے چارپائی پر سوئی ہماری اماں جان کی نیند اچاٹ نا ہو یہ سامنے امی جان حضرت عائشہؓ کا بستر ہے اور بستر بھی کیا ہے بان کی کھری چارپائی ہے۔ یہی چٹائی جو جائے نماز بنی اسے ہی چارپائی پر بچھا کر سرکارؐ دو عالم رات کو استراحت فرماتے ہیں ایک رات اسی طرح آپ حضرت میمونہؓ کے گھر میں لیٹے ہوئے امت اور امتیوں کے فکر میں تھے نیند آپ کی آنکھوں سے کوسوں

دور تھی روایات میں آتا ہے کہ ہماری سبھی ماؤں میں ام المومنین حضرت میمونہ بہت ہی خوبصورت تھیں (راقم کو حضرت میمونہ کی قبر مبارک دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میرے اک عزیز گزشتہ 32 سال سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں اسٹیل اور ایلومینیم کی مصنوعات بنانے والی ورکشاپ چلاتے ہیں۔ مکہ مکرمہ کے مضافات میں مقامی لوگ روایت کرتے ہیں کہ یہ قبر مبارک حضرت میمونہ کی ہے کیسی کمال کی ہماری مائیں تھیں اور کیسے کمال کے ان کے عظیم المرتبت شوہرؐ۔ کہ ان ہی کی وجہ سے دین عورتوں میں پھیلا) جب لوگوں کا اک جم غفیر ایمان لے آیا تو مسجد نبویؐ میں سارا دن دور دراز سے وفود آتے۔ اللہ کے سچے رسول انھیں دین کی تعلیم دیتے۔ حرام اور حلال کے بارے فرائض اور واجبات کے بارے تعلیم کے ذریعے دین سکھاتے۔ مستورات میں یہی کام ہماری مائیں سرانجام دیا کرتی تھیں اور یہی امہات المومنین کی اہمیت ہے۔

ایک بار پھر حضرت میمونہؓ کے اسی چھوٹے سے گھر میں آپ کو لیے چلتے ہیں۔ اللہ کے سچے رسولؐ کے ہاں آج رات رت جگا ہے یہ کیا رت جگا ہے جو دنیا کا نقشہ بدلنے والا ہے کہ اس کے نتیجے میں اسلام چار براعظموں کو پھلانگ کر گزر جائے گا۔ آپؐ رفع حاجت کے لئے اس ننھے منے گھر سے نکلتے ہیں فراغت کے بعد واپس تشریف لاتے ہیں۔ اماں جی حضرت میمونہؓ اب جاگ رہی ہیں۔ فرمانے لگیں:

''نیند ہی نیند میں میں نے بستر پر ہاتھ پھیرا تو پتہ چلا تاجدار ختم نبوت گھر سے باہر تشریف لے گئے ہیں کیا کسی دوسری زوجہ کے گھر جانا ہوا؟ اگر جانا ہی تھا تو بتا کر چلے جاتے''۔

بردباری اور معاملہ فہمی کی معراج دیکھئے۔ آپ نے فرمایا ''میمونہ میں تو رفع حاجت کے لئے باہر ذرا آبادی سے دور گیا تھا اور وہیں سے واپس تمھارے پاس آ گیا ہوں''

آپؐ تحمل کے ساتھ لیٹ گئے۔ اماں جان کو پچھتاوا ہوا۔ آپ اکثر اس واقعہ کا ذکر فرمایا کرتی تھیں کہ آپؐ نے جواب میں معاذ اللہ نا ہی کوئی تلخ جملہ کہا نا ہی رنجیدہ ہوئے۔ چپ چاپ بستر پر لیٹ گئے اس کمرہ نما گھر کی چھت یوں تو عرش بریں ہے مگر دنیاوی نظروں کے لحاظ سے اس پر کھجور کی ٹہنیاں دھری ہیں جن میں سے جسم و جاں پر چھا جانے والی سورج کی تیز گرم کرنیں پڑتی ہیں اس چھت کے نیچے ہر رات بہائے گئے آنسو کتنے پوتر اور پھل تھے جو ہم جیسوں کے راہنما بنے یہ کیا دکھ تھا جو میرے سکھ کے لئے تھا ایک ڈھل مل یقین امتی کے لیے جس کے ہاں عبادات میں ہمیشہ سستی نماز میں کوتاہی اور تلاوت میں بے یقینی ہوا کرتی ہے ہائے:

اپنی کوتاہیِ فن یاد آ جائی

اگر کوئی صاحب دل صاحب حال بندہ رحمت دو عالم کا حشر کے دن سامنا کرے گا تو کس حال میں کرے گا سوچے گا کہ نامہ اعمال میں بارگاہِ رسالت میں دکھانے کو کچھ نہیں میرے پاس بہت حسین اعمال تو نہیں مگر میں نے انساں سے انسانیت سے محبت کی ہے۔ میں نے کوشش کی کہ

کسی بھی سوالی کو اپنے مکان کی چوکھٹ سے خالی جھولی نا بھیجوں۔ میں نے یہ بھی کوشش کی کہ مال کی محبت دل سے نکل جائے اس کی مشق بھی کی یوں کہ اپنی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ رکھی جب کوئی مفلس آیا پھر یہ نہ پوچھا کہ وہ مستحق ہے یا نہیں پھر صاحب دل بندہ سوچتا ہے جب اس نے سوال کر دیا تو پیچھے کچھ نہیں بچا:

کچھ بھی نہیں بچا جسے رکھیں سنبھال کر
ہم نے یہ فیصلہ کیا سکہ اچھال کر

پھر گھر والوں سے کہا یا دکان پر ہیں تو ملازم سے کہا دفتر میں ہیں تو نائب قاصد سے کہا سوالی کی مدد کر دیں کہ اپنی جیب اور اپنا دامن تو خالی ہے یہ خالی رکھنا ہے ایسا کرنے سے بہت آفاقہ ہو جاتا ہے بار بار نوٹ گننے سے بندے کے دل میں نوٹوں کی الفت پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ احتیاط صرف دل والوں کے لیے ہے عوام الناس کے لئے واقعی رزق حلال عین عبادت ہے مگر جو قرآن مجید نے کہا:

"تمھیں اپنے مال سے محبت ہے بہت زیادہ محبت (الفجر 20-)

صاحب دل بندہ دل ہی دل میں بارگاہ رسالت میں عرض کرتا ہے "اے میرے آقا میں نے ہمیشہ مسکین کی مدد کی دل سے کہا کبھی جھڑکی نا دینا سوال کرنے والے کو یہ نہ کہنا کہ تو مستحق نہیں تو کسی قابل نہ تھا تو مستحق نہیں تھا مگر تیرے رب نے تیرا ہاتھ اوپر والا بنایا۔ تجھے کسی کے سامنے تلی کرنی پڑتی خالی ہاتھ پھیلانا پڑتا تو تجھے پتہ چلتا کہ سوال کرنے والا نہ جانے انا کے کتنے بت توڑ کر تیرے پاس آیا۔ صاحب دل بندہ دکھی ہوتا ہے کہ میرے لیے آپ کیوں روئے آپ نے خود فرمایا کہ جتنی تکالیف اور دکھ میری جان کو پہنچے اور کسی نبی کو ان سے واسطہ نہ پڑا۔ مگر میں جانتا ہوں آپ اپنے دکھوں کے لئے نہیں آپ تو راتوں کو میرے لئے روئے ان کی تو اپنی کوئی بھی ذاتی خواہش ہی نہ تھی بس ایک آرزو تھی کہ دین دنیا میں عام ہو جائے ان کی پاکیزہ آنکھیں اسی لئے نہیں اور دریا بنی رہیں اگر معاذ اللہ ذاتی خواہش ہوتی تو مکہ ہی میں مشرکین نے انھیں ہر طرح کی دولت کی خوبصورت عورت کی پھر سرداری کی آفر کی اگر معاذ اللہ ذاتی خواہش ہوتی تو وہ اس مندرجہ بالا ایک مرلے کے گھر میں رو کر آنسو نہ بہاتے وہ سچل تھے اور سچے تھے اسی لیے ان کی اس عظمت کا اعتراف غیر مسلموں نے بھی کیا۔

The Hundred پچاس سال میں پورے امریکہ یورپ اور دنیا کے سبھی ملکوں میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ہے جس میں مصنف مائیکل ہارٹ نے دنیا کی عظیم ترین 100 ہستیوں کا ذکر کیا اس کتاب کا پہلا ایڈیشن متعصب یہودیوں نے خرید کر کسی نامعلوم جگہ چھپا دیا۔ دوسرے ایڈیشن کے ساتھ بھی یہی ہوا کیونکہ اس کتاب میں اس فہرست میں سب سے پہلے نمبر پر سرکار دو عالم کا ذکر کیا گیا اور آپ کے اوصاف حمیدہ کا پھر انسانیت پر آپ کے احسانات کا تذکرہ کیا گیا حالانکہ مصنف خود عیسائی تھا۔ عیسائی لوگوں نے بھی مصنف پر اعتراض کیا کہ پہلے نمبر پر

تو حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ہونا چاہئے تھا اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن پر بہت بڑا مجمع اکٹھا ہوا جس نے مائیکل ہارٹ پر آوازے کسنا شروع کئے تو وہ سب کے سامنے اسٹیج پر آکر کھڑا ہو گیا۔ راتوں کو میرے لئے اُٹھ کر رونے والی اس عظیم ہستی اور میرے ہادی برحقؐ کے بارے میں اس نے صرف دو جملے کہے جنھیں سن کر مشتعل ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔ اس نے کہا آپ سب ذرا اُس عظیم اور سچی شخصیت کے بارے سوچیں۔ ایک یتیم بچہ جس کا لڑکپن اور جوانی بے داغ تھی وہ چالیس سال کی عمر میں اعلان کرتا ہے کہ میں اللہ کا سچا رسولؐ ہوں تو صرف گھر کے دو بچے (حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زید بن حارث) اس کی بیوی اور ایک دوست (سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ) ایمان لائے مگر آج پونے دو ارب لوگ ان کے نام لیوا ہیں حاضرین و سامعین جھوٹ (معاذ اللہ) پندرہ سو سال تو چل نہیں سکتا۔ ان کے فضائل ان کی رفعتیں اور عظمتیں ہی اتنی تھیں کہ میں نے کرسچین ہوتے ہوئے بھی 100 مشہور شخصیات جو اس کرہ ارض پر آئیں ان میں سے نمبر 1 پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام رکھا کہ یہ میرے ضمیر کا فیصلہ تھا۔

وی ہنڈرڈ میں دوسرے نمبر پر آئن سٹائن اور تیسرے نمبر حضرت عیسیٰؑ کا اسمِ گرامی ہے آئن سٹائن کی سائنسی خدمات کو اک طرف رکھ کر اگر دیکھیں تو اس نے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اس کے بنائے ہوئے ایٹم بم نے لاکھوں لوگوں پر تابکاری اثرات چھوڑے جبکہ میرے آقاؐ نے انسانیت کو زندگی عطا کی انھیں جینے کے ایسے اصول سکھائے کہ جس قوم میں وہ مبعوث ہوئے اس نے رومۃ الکبریٰ اور فارس جو اس زمانے کے روس امریکہ تھے انہیں زیر نگیں کر لیا اب ایسے جانثار اور جید صحابہ کے سردار اور وجہ وجود کائنات اگر میرے لئے روئے اور وہ بھی رات کے پچھلے پہر تو یہ اک خوشگوار حیرت والی بات ہے کیونکہ:

پہلا پہر تو ہر کوئی جاگے
دوجا نا جاگے کوئی

.....

اتنی محبت ایسی چاہت ایسی دلداری اور ایسا اُنس تو سگے ماں باپ اور بہن بھائی یا جگری دوست بھی نہیں کرتے۔ دو عالم کے سردار اور میرے جیسے بندے کے لئے روئے دل نے بارگاہِ رسالت میں بصد ادب و احترام عرض کیا میرے آقاؐ آپ کیوں روئے مجھ سے دوسری بار کبھی کسی نے مصافحہ نہیں کیا۔ جن کی کسی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا آپ ان کے لئے بھی روئے یہ کیسا کرم ہے کہ کرم کی انتہا بھی اس کرم کو دیکھ کر مند چھپائے پھرتی ہے۔ میرے آقاؐ میں اک غریب الدیار شخص ہوں اک مسکین اور قلاش آدمی ہوں مگر جس دن سے مجھے پتہ چلا کہ میرے آقا میرے لئے روئے میں مسکین سے سلطان بن گیا:

عالیشان بن گیا - کوہ سلیمان بن گیا

☆☆☆☆☆

خالد احمد شخصیت و فن ___ بدست نعمان منظور

ٹالسٹائی سے کسی نے سوال کیا کہ انسانوں کی کتنی اقسام ہیں۔ اس کے جواب میں ٹالسٹائی نے تاریخی جملہ کہا کہ جتنے انسان ہیں اتنی ہی اقسام ہیں۔

ایک عام نارمل آدمی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بھی آسان نہیں جبکہ کسی بڑے شاعر، ادیب اور انسان کے بارے میں کتاب ترتیب دینا اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی شخصیت کا احاطہ ہو سکے کارِ دشوار ہے۔

ہجر کے راستے بھی عجب ہیں۔ جدائی اور وہ بھی دائمی جدائی، جدا ہونے والے شخص کی ایسی خوبیاں اور اچھائیاں بھی منکشف کرتی ہے، جو اس کی زندگی میں دوسروں کی آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں اور اگر یہی شخص ایک بڑا تخلیق کار بھی ہو، تو خالص، سچی اور کھری رائے کا میسر آ جانا بھی کسی معجزے سے کم نہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ذاتی پسند اور ناپسند اور اپنے تعصبات سے علیحدہ نہیں۔ اب تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محبت اور عقیدت بھی تعصب کی کوئی بہتر صورت ہے۔ کہ بہرحال یہ اعتراف اور اثبات کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے۔

خالد احمد صاحب کے لیے کتاب ترتیب دینا ایسا ہی ایک مشکل کام ہے کہ خالد احمد نہ صرف یہ کہ بڑے شاعر ہیں بلکہ بطور انسان بھی اُن کی بڑائی سے انکار ممکن نہیں۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ خالد صاحب کے ساتھ ایک شام شیزان ہوٹل مال روڈ میں منعقد ہوئی اور خالد صاحب پر مضمون بھی پڑھے گئے اور ان کی شخصیت اور فن کے حوالے سے گفتگو بھی ہوئی۔

خالد صاحب نے اپنی تقریر میں سب کا شکریہ ادا کیا اور انتہائی خوبصورت بات کہی

منظر حسین اختر

کہ آج کی تقریب میں ان مضامین کی شکل میں جو لباس مجھے پہنائے گئے ہیں وہ یا تو بہت کھلے ہیں یا بہت تنگ ہیں۔

لمحات وہ سادہ اوراق ہیں، جن پر انسان اپنی داستان حیات لکھتا چلا جاتا ہے اور اس کے ہم سفر اور اس کے ہم نشیں اس کے گواہ ہوتے ہیں اور کسی بڑے آدمی اور تخلیق کار کا دنیا سے اُٹھ جانا اور اس سانحے کے بعد اس کے ہم سفروں اور ہم عصروں کی گفتگو بقا کے مفاہیم خوب بتا دیتی ہے۔

خالد احمد ایک ایسے بلند پایہ شاعر، ادیب اور انسان تھے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ ادب کی مختلف اصناف میں اعلیٰ درجے کا اظہار کیا بلکہ انھوں نے نوجوانوں اور نئے لکھنے والوں کی نہ صرف یہ کہ حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کی علمی تربیت بھی کی۔ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ جن دنوں وہ الفضل ہوٹل لکشمی چوک میں باقاعدہ شام کو بیٹھا کرتے تھے۔ نئے لکھنے والے اکثر اپنی غزلوں، نظموں کے ساتھ ان کے پاس آتے اور ان کو اصلاح کی غرض سے پیش کرتے اور وہ ان کو انتہائی توجہ اور محبت سے پڑھتے۔ یوں ہر نئے آنے والے کو اپنے اہم ہونے کا احساس ہوتا۔ اور اگر ان میں سے کسی شاعر میں انھیں امکانات دکھائی دیتے تو وہ اس کی کسی نظم یا غزل کا کوئی ٹکڑا یا مصرعہ پڑھتے اور پھر اس کے سامنے یعنی ہم سب کی موجودگی میں اسے ہر دفعہ نئے انداز سے دہراتے کہ اسی بات کو کہنے کا یہ ڈھنگ، اور ڈھب بھی ہو سکتا ہے۔

خالد احمد کی زندگی ایسے ہزاروں واقعات سے بھری پڑی ہے۔

جناب نعمان منظور کی کتاب، خالد احمد کے اسی سفر کی داستان ہے، ان کے ہم عصروں اور ہم سفروں کی گواہی ہے۔ ان کے عقیدت مندوں کا اظہار یہ ہے اور مستند نقادوں کا ان کے حوالے سے اعتراف فن اور اعتراف عظمت ہے۔

جناب نعمان منظور صاحب نے بھی ان کے حوالے سے اظہار کیا ہے اور خوبصورت مضمون لکھا ہے اور اس کثیر الجہتی کام کی ایک کتاب میں یکجائی لائق صد تحسین ہے اور قارئین کے لیے نئی روشنی ہے۔

یہ کتاب ہر اعتبار سے ایک خوبصورت دستاویز ہے۔

خالد احمد صاحب کی فن اور شخصیت کے حوالے سے جناب نعمان منظور کی یہ کتاب نئے قارئین، مداحین اور نئے نقادوں کے لیے ایسے نصاب کی حیثیت رکھتی ہے جس سے نئے در وا ہوں گے اور خالد احمد صاحب کی ہمہ جہت شخصیت کی بڑائی اور شعری عظمت کے حوالے سے نئے رستے کھلیں گے۔

☆☆☆☆☆

دریاؤں کا اپنا کیا تھا

گزشتہ دنوں محترم یعقوب پرواز نے اپنا اولین شعری مجموعہ ''شام سے پہلے'' عنایت کیا تو مجھے فوری طور پر اُن کی معروف نعت کے چوری کیے جانے کا افسوسناک واقعہ یاد آ گیا۔ان کی نعت کا مطلع ہے:

جس طرح ملتے ہیں لب، نام محمدؐ کے سبب
کاش ہم مل جائیں سب، نام محمدؐ کے سبب

.....

اس شعر کے ضمن میں پہلے تو مجھے بھی معذرت کرنا ہے کہ میں نے 2010 میں نعت کا ایک انتخاب بہ عنوان ''نئی صدی نئی نعت'' ترتیب دیا تو یہ شعر یعقوب تصور کے نام سے اپنے دیباچہ میں شامل کر لیا اور کتاب کی اشاعت کے بعد یعقوب پرواز صاحب نے توجہ دلائی تو شرمندگی ہوئی۔ میں نے معذرت بھی کی اور وہ دیباچہ ایک رسالے میں دوبارہ شائع کرا کے اس غلطی کے ازالہ کی کوشش بھی کی۔ میں اس کوتاہی پر باردگر معذرت خواہ ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے یعقوب پرواز صاحب کے فیس بک اکاؤنٹ پر ایک پوسٹ نظر سے گزری جس میں مذکورہ شعر ہی نہیں پوری نعت کے چوری ہونے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ چوری اور وہ بھی نعت کی۔ ایسے واقعات اگرچہ عام ہیں اور شعر تو شعر لوگ اب پوری پوری کتابیں چرانے لگے ہیں۔ یعقوب پرواز صاحب نے اکیس دسمبر 2020 کو فیس بک پر لکھا کہ ''نہایت افسوس کے ساتھ یہ بات احباب کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں کہ ایک

خورشید ربانی

شخص سید نجم الحسن نجمی نے 2017 میں ایک کتاب ''دولت ایمان'' شائع کی جس میں میری مشہور و معروف نعت:

جس طرح ملتے ہیں لب، نام محمدؐ کے سبب
کاش ہم مل جائیں سب، نام محمدؐ کے سبب

.....

اپنے نام سے شائع کر دی اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع کروا دیا۔ اس دیدہ دلیری پر جتنا بھی افسوس کیا جائے، کم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ سستی شہرت کے پجاری کیسی کیسی حرکات کرتے ہیں۔ دوکھوں کی خاطر مستقل بدنامی ایسے لوگوں کا مقدر بن جاتی ہے۔ میرے ہم عصر اور دیگر احباب بخوبی جانتے ہیں کہ مذکورہ نعت چالیس سال قبل تخلیق ہوئی اور سب سے پہلے ماہنامہ ضیائے حرم، میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں متعدد ادبی پرچوں کی زینت بنتی رہی جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔ ماہنامہ ضیائے حرم، ماہنامہ سیارہ، نعت نمبر ماہنامہ شام و سحر 1985، ماہنامہ کوثر، ماہنامہ بیاض 2017، بہار نعت پاکستان رائٹرز گلڈ صوبہ پنجاب مرتبہ حفیظ تائب، منتخب شاہکار نعتیں مرتبہ سعد اللہ شاہ، مارچ 1991، نعت مصطفیٰ 101 منتخب نعتیں مرتبہ ناصر زیدی، نعتیں حضور کی، مرتبہ یعقوب مختار، نعتیہ انتخاب مرتبہ مکتبہ علم و ادب القلم، گورنمنٹ کالج چوکی 2005، ماہنامہ بندگی لاہور، روزنامہ مشرق مورخہ 18.12.83، روزنامہ امروز مورخہ 25.12.88، ماہنامہ ماہِ نو، ماہ نومبر 1990، ماہنامہ جمالستان فروری 1991، ہفتہ وار ملتان روڈ، روزنامہ پاکستان اور نوائے ہومیوپیتھی جبکہ یہی نعت میرے اولین شعری مجموعہ ''شام سے پہلے'' مطبوعہ 1990 اور 1994 میں شامل ہے۔ اس گھناؤنے ادبی سرقہ پر میں سید نجم الحسن نجمی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہوں''۔ اس پوسٹ کے بعد میں نے یعقوب پرواز صاحب سے بات کی تو انھوں نے اس افسوسناک واقعہ کی تصدیق بھی کی اور یہ بھی بتایا کہ نجمی صاحب کی کتاب میں باقی کلام بھی چوری ہی کا ہے اور یہ کہ نجمی صاحب نے مجھ سے معذرت کر لی ہے۔ مجھے حیرت اور افسوس اس بات پر ہے کہ کیا اس معذرت سے یعقوب پرواز کی دل آزاری کا سدباب ممکن ہے۔ اگر نہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا کیا جانا چاہیے؟۔ کیا ادبی حلقے اس طرح کے واقعات کی روک تھام کے لیے کوئی لائحہ عمل بنانے کی جرأت نہیں کر سکتے؟ کیا مذکورہ کتاب بین نہیں ہو سکتی؟ کیا اس شاعر بل کہ

متشاعر کا بائیکاٹ نہیں کیا جا سکتا؟ کیا اس ظلم پر یہ احتجاج، کالم، مضامین اور یعقوب پرواز صاحب کی وضاحت ہی کافی ہے؟ ہمیں سوچنا ہوگا اور سنجیدگی سے ایسے معاملات کا نوٹس لینا ہوگا تاکہ اس طرح کی چوری اور سینہ زوری کا قلع قمع کیا جا سکے۔ اسی طرح کا ظلم میرے ساتھ بھی ہوا ہے کہ ایک صاحب نے میری مرتب کردہ ایک کتاب مکمل طور پر اپنے ایم فل تھیسز میں شامل کر لی ہے۔ اگرچہ انھوں نے میری کتاب کا حوالہ دیا ہے مگر یہ کیسی تحقیق ہے کہ آپ کسی کی پوری کتاب ہی اڑا لیں۔

قارئینِ ادب کو اس معاملے سے آگاہ کرنا ضروری تھا، سو کتاب پر بات سے پہلے اسے مذکور کیا۔ اب آتے ہیں ''شام سے پہلے'' کے مندرجات پر، یعقوب پرواز کی شاعری جدید حسیت کی نمائندہ ہے، نئے مضامین اور نئے مفاہیم کی حامل اس شاعری کا سفر ذہن و دل کی یکجائی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اشعار گہری معنویت کے حامل ہیں اور اپنی تاثیر میں بہت آہستہ رو ہیں، اسی لیے شعر کی قومی فضا میں یعقوب پرواز کم آمیز مگر دیرپا اثر کے حامل شعرا میں شامل ہیں۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار دیکھیے:

آنسو تھے پرواز کسی کے
دریاؤں کا اپنا کیا تھا

بڑا ہے حلقہ احباب میرا
غنیموں میں مگر محصور ہوں میں

ہوا کی چال چل جائے گا تُو بھی
خبر کیا تھی بدل جائے گا تُو بھی

کہاں ٹھہری ہے خواہش کوئی دل میں
مرے دل سے نکل جائے گا تُو بھی

اب چلے گی خوب اپنی دوستی
تم ملے، تم سے طبیعت بھی ملی

کیا اُس کی بے بسی پہ کوئی تبصرہ کرے
ڈرتا ہو آہ سرد بھی جو کھینچتا ہوا

خواہشِ پرواز ہے زندہ تو کچھ بگڑا نہیں
لے اڑیں گے ایک دن اونچا یہی بیکار، پر

آپ کا آنا نہ آنا آپ کی مرضی پہ ہے
دل کا دروازہ بہر صورت کھلا رکھیں گے ہم

حسنِ فطرت کو نہ جانے کھا گئی کس کی نظر
باغ میں بلبل نہیں، دشت میں آہو نہیں

جن کی قسمت میں کوئی جگنو، کوئی تارا نہ ہو
وہ شبِ مہتاب دیکھیں تو بیاں کیسے کریں

اُمڈتے ہی چلے آتے ہیں آنسو
مرے اندر کوئی غم خوار سا ہے

مرے بچے بھی ہیں مجھ سے گریزاں
کھلونا ہوں مگر ٹوٹا ہوا ہوں

افلاک پر ازل سے ستارے سفر میں ہیں
گھبرائیں کیا کہ بخت ہمارے سفر میں ہیں

ٹوٹ کر برسی ہے اب کے خشک سالی کھیت میں
فصل کی جا بھوک اُگ آئی مثالی کھیت میں

پھل تو مل ہی جائے گا پرواز لیکن یہ بتا
ہل چلایا، بیج بویا، کھاد ڈالی کھیت میں؟

دل بیچتے تھے ریشمی رومال کے عوض
تھے ابتدا میں اس قدر کچے حساب کے

آبِ رواں پہ تیرتے پھرتے تھے رات دن
ہم جن دنوں اسیر تھے چشمِ حباب کے

رہین آب و دانہ ہی سہی آوارگی اپنی
گھروں کو لوٹ آتے ہیں پرندے شام سے پہلے

پرندہ آنکھ والا تھا یقیناً
شکاری ہاتھ ملتا جا رہا ہے

گھر سے باہر لاش پڑی تھی
گھر کے اندر رقص بپا تھا

ماضی کا انسان سنا ہے
غیرت سے بھی مر جاتا تھا

خود سوچ لو کہ مسئلہ کیسا ہے سامنے
پیچھے عدو کی فوج ہے، دریا ہے سامنے

.....

مذکورہ بالا اشعار جدید غزل کی روایت کے آئینہ دار بھی ہیں اور اس بات کے شاہد بھی کہ یعقوب پرواز سماجی معاملات پر کس قدر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب تو بہت پہلے عرصہ شائع ہوئی مگر مجھے پڑھنے کا موقع اب ملا تو چاہا کہ اپنا مطالعہ قارئین سے شیئر کر لوں اور ایک اہم مسئلہ یعنی سرقہ کا معاملہ بھی قارئین اور بالخصوص ادبی دنیا کے سامنے رکھوں کہ وہ اس حوالے سے کوئی لائحہ عمل ضرور بنائیں تاکہ ایسے ظالموں کی حوصلہ شکنی اور مظلوموں کی دادرسی ہو۔

☆☆☆☆☆

سانس لیتے شہر میں محبت بانٹتا ادیب.....طاہر شیرازی

انسانی جذبوں کے اظہار کا فن روز ازل سے ہی انسان کے ساتھ ساتھ مختلف اضاف کی صورت میں موجود رہا اور حیات انسان کے صدیوں پر محیط ارتقائی سفر میں اس کا ہم رکاب وہم سفر بھی، ناول کی صنف اگر چہ ادبیات مغرب سے اردو زبان و ادب کا حصہ بنی لیکن ڈیڑھ صدی کی ارتقائی سفر کے بعد اردو ناول آج ہمیں بین الاقوامی سطح پر خطے کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتا دکھائی دیتا ہے ناول کو حیات انسان کی تعبیر بھی کہا گیا ہے اور انسانی جذبوں کی تفسیر بھی، اس صنف کو پاکٹ تھیٹر بھی قرار دیا گیا ہے اور چاول کے دانے پر تصویر کشی بھی، ایک برٹش جرنلسٹ رالف فاکس نے ناول کو دور حاضر کی رزمیہ نگاری کا فن قرار دیا اور ڈی، ایچ لارنس نے ناول کو گلیلیو کی دوربین سے بھی بڑی ایجاد قرار دیا ہے پریم چند کے خیال میں ناول انسانی کرداروں کی مصوری ہے اور ای چیمبرز کے نزدیک ناول ایک ایسی طویل بیانیہ نثر ہے جس میں حقیقی زندگی پیش کی جاتی ہے اور ایڈمنڈ برک کے خیال میں ناول حقیقت سے بھی آگے کی چیز ہوتی ہے۔

عہد حاضر کے اردو ناول کے باول کے منظر نامے کو دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ شاید ہی انسانی زندگی کا کوئی پہلو ہو کہ جو عہد حاضر کے ناول نگاروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا ہو یہی وجہ ہے کہ آج نفسیات، عمرانیات سیاسیات کے ساتھ ساتھ جملہ علوم وفنون زندگی کی کارفرمائی کی وجہ سے اردو ناول کا دامن بہت وسیع اور موضوعات کے حوالے سے مالا مال نظر آتا ہے لیکن تمام تر علوم و فنون اور ایجادات واختراعات اور سائنس فکشن کے ساتھ ساتھ جو جذبہ بنیادی طور پر ادب کا محور ہے وہ جذبہ محبت کا بنیادی و انسانی جذبہ ہے ناول کی روح پیچیدگی کی روح ہے ہر ناول اپنے قاری سے کہتا ہے کہ ”چیزیں اس قدر سادہ نہیں جتنا تم سمجھتے ہو“ یہی ناول کی دائمی سچائی ہے مگر آسان اور سریع جوابات کے نقار خانے میں جو سوال سے پہلے ہی نمودار ہو جاتے ہیں اس سچائی کو سننا آہستہ آہستہ مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے اور بالا آخر اس کا رراستہ رک جاتا ہے ہمارے عہد کی روح کے مطابق قدیم دانائی جو ہمیں جاننے کے کھٹن مرحلے اور سچ کے ناقابل گرفت ہونے کے بارے میں میں بتاتی ہے اس عہد میں بوجھل اور بے کار

محمد شفیق

دکھائی دیتی ہے۔

ناول کی روح تسلسل کی روح ہے ہر تصنیف گزشتہ تصانیف کا جواب ہوتی ہے ہر ناول بے ناول کے گزشتہ تمام تجربے کو سموئے ہوئے ہوتا ہے مگر ہمارے عہد کی روح نہایت مضبوطی سے ایک ایسے حال پر مرتکز ہے جو اس قدر حاوی اور فرارواں ہے کہ ہمارے افق سے ماضی کو پرے دھکیل دیتا ہے اور وقت کو صرف لمحہ موجود میں تخفیف کر دیتا ہے اس لیے اس نظام میں ناول اب ایک ایسی تصنیف نہیں رہا بلکہ بہت سی لہروں میں سے ایک لہر بن کر رہ گیا ہے اور ایک ایسا اشارہ جس کا کوئی آنے والا کل نہیں ہے ادیب بیک وقت دو دنیاؤں سے اکتساب کرتا ہے اور شعوری ولا شعوری طور پر معاشرے اور دنیا سے متاثر ہوتا ہے اس کے اندر رد و قبول کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو اس کے تلازمہ حیات کو تلازمہ لفظی میں بدلنے والا تخلیقی عمل ہے اس طرح ہر ادیب کا اکتساب الگ ہوتا ہے اور ہر تخلیق الگ تخلیق ہوتی ہے اور ہر مصنف اپنے تجربات زندگی یا اکتساب زیست کے مطابق ہی لکھتا ہے اور طاہر شیرازی کی نثری تصنیف ''سانس لیتے شہر میں محبت'' ان کے شعوری و لاشعوری اکتسابات کی پہلی جھلک ہے طاہر شیرازی ایک نامور اردو سرائیکی شاعر اور جانے پہچانے ادیب ہیں جن کے اب تک تین مجموعے اردو شاعری کے، انحراف، ماسوا اور تکوین منظر عام پر آ چکے ہیں جبکہ ایک سرائیکی مجموعہ جاتراں بھی منظر عام پر آ چکا ہے ان کے ناول ''سانس لیتے شہر میں محبت'' نے جہاں یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک عظیم تخیل کے مالک شاعر مانے جاتے ہیں وہاں یہ بات بھی روز روشن کی طرح واضح ہو گئی ہے کہ وہ نثر نگار بھی اعلیٰ پائے کے ہیں جس کہ منہ بولتا ثبوت ان کا یہ ناول ''سانس لیتے شہر میں محبت ہے''

''سانس لیتے شہر میں محبت'' میں ہمیں کئی رنگوں کی کہکشاں نظر آتی ہے جسکا ہر رنگ دیدہ زیب اور چمکتا دمکتا دکھائی دیتا ہے اس ناول میں طاہر شیرازی نے سرائیکی ادب کا خوبصورت اور مستند لبادہ اردو رنگ میں پیش کیا ہے یعنی پورا ناول اردو کا ہوتے ہوئے بھی سرائیکی روایتوں کا امین نظر آتا ہے ''سانس لیتے شہر میں محبت'' میں جہاں ہمیں سرائیکی ثقافت کی بھرپور نمائندگی نظر آتی ہے وہاں ہمیں اس ناول میں اپنی تہذیب و ثقافت کا بھی خوبصورت عکس دکھائی دیتا ہے جو ناول کے ہر کردار ہر منظر اور ہر صفحے پر بکھرا ہوا محسوس ہوتا ہے شیرازی صاحب نے اپنی اس پہلی کامیاب اور خوبصورت نثری کاوش میں سلاست نگاری کا دامن تھامے ہوئے اپنے روز و شب کا دلکش حقیقت نگاری کے روپ میں تجزیہ پیش کیا ہے ان کا یہ منفرد طرز تحریر کئی تاریخی پیچوں سے اپنے پلاٹ کو استوار کیے ہوئے ہے طاہر شیرازی کا مشاہدہ کائنات عمیق ہے جسکی وجہ سے وہ سازشوں، سفاکیوں کو بڑی

جرأت کے ساتھ بے نقاب کرتے ہیں جنھوں نے فطری حسن سے مالا مال اس کائنات کو دوزخ میں بدل دیا ہے جن سے دلوں کی دھڑکنیں رک گئی ہیں اور زندگی کا حسین سفر حالات کی گرد سے اٹ گیا ہے من کی بستیاں اجڑ گئی ہیں... راستے ہیں اور نہ منزلوں کا پتہ اس لیے اب بھٹکنا ہی مقدر ٹھہرا۔ طاہر شیرازی ''سانس لیتے شہر میں محبت'' میں کرکی گارڈ کی طرح موضوعیت کے تناظر میں زندگی کو جانچتے ہیں اور سارتر اور کامیو کی طرح زندگی کو کھوکھلا اور لغو نہیں کہتے بلکہ وہ موضوعیت پر اپنے افکار کی عمارت استوار کرتے ہیں جن میں آفاقیت اور انقلابیت کی کوشبو رچی بسی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس میں سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور معاشرتی توازن دکھائی دیتا ہے تاکہ کراتی انسانی زندگی بھیانک ماحول سے نکل کر ارفع اخلاقی اقدار کے سائے میں سانس لے۔ اس لیے موصوف پرعزم اور پرامید ہو کر جمود زدہ انسانوں کو اپنے وجود کا احساس دلا کر ان کے ضمیر و احساس کو جگا کر اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں۔

''سانس لیتے شہر میں محبت'' میں سادہ تحریر اور ایک روایتی داستان کا آغاز آگے چل کر کئی مقامات پر چونکا دینے والے مناظر سے انسانی سوچ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے طاہر شیرازی صاحب نے اس ناول میں اگر میں کہوں تو ڈیرہ اسماعیل خان کی پوری دھرتی کے تمام ثقافتی، تاریخی، سماجی، معاشی اور معاشرتی رنگوں کو تمام کرداروں کے ذریعے دھنک کی صورت پیش کیا ہے تو شاید بے جا نہ ہو گا کیونکہ شیرازی صاحب جیسا منجھا ہوا ادیب جن کی شخصیت میں، خوش گفتاری، زندہ دل خندہ پیشانی جیسے کئی دروا ہوتے ہیں اسی لیے اس ہمہ جہت شخصت نے گوشہ نشینی کے باوجود ''سانس لیتے شہر میں محبت'' کی صورت میں ایک ایسی خوبصوت کہکشاں پیش کی ہے جو ان کے مستند ادیب ہونے کا ایک واضح ادبی ثبوت ہے ناول کے اندر نظر آنے والے منظر نامے اپنے اندر تاریخ کا ایک مربوط اور خوبصوت باب سمیٹے ہوئے ہیں جس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے کردار میں یہ عکس جھلکتا ہوا نمایاں نظر آتا ہے۔

سائنسی عروج نے انسان کو خصوصی مہارت کے علوم کی سونگوں میں دھکیل دیا ہے اور جیسے جیسے اس کا علم بڑھتا گیا اسی اعتبار سے وہ یا تو دنیا کی بحیثیت مجموعی یا بذات خود اپنی ذات کو واضح انداز میں دیکھنے کے قابل نہ رہ سکا اور پھر وہ مزید ایک ایسی صورت حال میں پھنس گیا جیسے ایک خوبصوت اور تقریباً جادوئی فقرے میں یوں بیان کی جائے یعنی ''وجود کی فراموشی'' اور اسی وجود کی فراموشی کی گرہ کو کھولا ہے طاہر شیرازی نے ''سانس لیتے شہر کی محبت میں''۔

☆☆☆☆☆

آصف ثاقب کی غزل

کوئی وقت تھا کہ مضافات میں کہی جانے والی غزل ہمارے مرکزی معاشرتی نظام سے کوسوں دور تھی۔ اس کی وجہ شاید ابلاغ کا فقدان تھا۔ لیکن جیسے آواز اور خوشبو کو قید نہیں کیا جا سکتا اسی طرح مضافاتی غزل آواز اور خوشبو بن کر ملک کیا بیرون ملک بھی غزل کے عشاق کا دل بہلاتی رہی۔ اس وقت سوشل میڈیا بھی منظر عام پر نہیں آیا تھا، لیکن آج یہ گھر گھر میں موجود ہے۔ صرف اخبارات اور ادبی رسائل ہی کے ذریعے ادبی مراکز میں اور ان سے دور تخلیق ہونے والی شاعری قارئین ادب تک رسائی رکھتی تھی۔ اس وقت ہزارہ میں آصف ثاقب اور نیاز سواتی سب سے زیادہ اخبارات اور ادبی جریدوں میں جگہ پاتے تھے۔ سلطان سکون اور صوفی عبدالرشید جیسے سینئر شعرا اور نوجوان غزل گووں کا بہت کم کلام پرنٹ میڈیا میں پڑھنے کو ملتا تھا۔

آصف ثاقب کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ ''فنون'' کے منظر عام پر آنے کے بعد جلد ہی اس سے وابستہ ہو گئے اور اس میں باقاعدگی سے چھپنے لگے۔ ''فنون'' ملکی سطح پر ادبی رسالوں سے اہم اور نمایاں ادبی جریدہ ہے، جس نے ان کی غزل کی اہمیت کا اعتراف کیا اور اسے دنیا کے کونے کونے تک پہنچایا۔ احمد ندیم قاسمی ان کے فن کے معیار کے بے حد معترف تھے۔ وہ ان کے متعلق ان کے پہلے شعری مجموعے ''درکنار'' میں اپنی

ہارون الرشید

تحریر میں کہتے ہیں۔

"ہزارہ کے آصف ثاقب محبت کرنیوالے ایک خوبصورت انسان تو ہیں ہی۔ وہ باقاعدہ ایک Phenomenon ہیں۔ ان کی غزل پڑھیے، نظم پڑھیے، تنقید پڑھیے، نثر پڑھیے، مجال ہے جو ان کی تخلیقات میں کسی بڑے غزل گو، کسی بڑے نظم نگار، کسی بڑے نثر نویس کے اثرات کا کوئی دور دراز کا بھی سراغ مل سکے۔ وہ ہر حال میں منفرد ہیں۔"

اب مضافات کی غزل ادبی مراکز کے اندر سر چڑھ کر بولتی ہے۔ انتہائی کٹھن اور نامساعد حالات میں حقیقت، رومان، فطرت اور مٹی سے گہری محبت کی پروردہ غزل اس تناؤ اور اعصابی جنگ کے مارے ہوئے معاشرے میں دمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

بوئی ضلع ایبٹ آباد کی ایک سرسبز و شاداب وادی ہے۔ بلند و بالا پہاڑوں، گھنے جنگلوں، ہرے بھرے میدانوں اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے مرصع اس وادی کی چوٹی پر چڑھ کے درختوں کے بیچ کسی درویش حاکم کی قدیم مگر پرشکوہ حویلی کے باہر کرسی ڈالے یا کسی بڑے پتھر پر بیٹھے ہوئے جس شخص سے سب سے پہلے آپ کی ملاقات ہوگی وہ آصف ثاقب ہیں۔ انھوں نے طویل عرصے سے غزل کی جولان گاہوں میں گہری فکر اور عرق ریزی سے جہاں فنی کمالات کے گھوڑے دوڑائے ہیں وہاں انھوں نے اس میدان میں اس غزال کو بھی پکڑنے کی کوشش کی ہے، جو ان کی غزل کے میدانوں، گھاٹیوں اور تنگ راستوں پر کلانچیں بھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ آصف ثاقب کی غزل کی اٹھان محبت، حقیقت اور مقامیت کے خمیر سے ہوئی ہے۔

ان کی غزل خاک پر تپتی ہے، کندن بنتی ہے اور دلوں پر گہرے نقوش چھوڑتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

کیا قرینہ ہے غزل کے شرف کی خاطر
اپنے صدمات کا معیار بڑھاتے رہنا

آج جب کہ غزل ایک نئے عہد میں داخل ہو چکی ہے۔ اس کے مضامین کا انداز بدل چکا ہے۔ اینٹی غزل نے اسے گہرے چرکے بھی لگائے ہیں۔ اردو زبان میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ بھی تواتر سے جاری ہے۔ لیکن یہ سخت جان صنف اپنی مقبولیت کو ہنوز قائم رکھے ہوئے۔ ان شعرا کی تعریف نہ کرنا کم ظرفی ہوگی جنھوں نے غزل کی قدیم روایت کو ہمیشہ زندہ رکھا ہے۔ ان شعرا کے ہاں زبان صاف، شائستہ اور نکھری ہوئی دیکھنے میں آتی ہے۔ ان کے اشعار دیکھیں تو طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔ آصف ثاقب بھی انھی شاعروں میں شامل ہیں، جنھیں غزل کی آبرو اور

حرمت بے حد عزیز ہے۔ ان کی غزل کے لہجے کا آہنگ صوت اور دھیما انداز دل کو موہ لیتا ہے۔ غزل کہنا یقیناً کار سہل نہیں ہے۔ بقول کسے ''غزل چاول کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھنے کا عمل ہے۔'' اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ غزل کہتے ہوئے تن شاعر کا کتنا لہو خشک ہو جاتا ہے۔

مطالعے میں جہاں ، درد کا اثر آیا
لہو کتاب کے اوراق پر اتر آیا

.....

تمام شب مرے آنسو نہیں تھے ثاقب
وہ کون تھے کہ میں جن سے بچھڑ کے گھر آیا

.....

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔ شعری مجموعوں کی بہتات میں پچھلے چھ سات عشروں سے غزل کہنے والے آصف ثاقب صحیح معنوں میں ایک رشی ہیں، کن کا اوڑھنا بچھونا غزل ہے۔ وہ ایک ایسے مصور ہیں، جو لفظوں سے رنگ کام لیتے ہیں، درد کی مالائیں بناتے ہیں، آنسوؤں سے امیدوں کے چراغ جلاتے ہیں۔

لہو میں پھول کی شبنم چھپائے رکھتے ہیں
ہماری آنکھ میں یہ روشنی نہیں آتی

اسی کے غم کی امربیل ہم نے پہنی ہے
وہ سوچتا ہے ہمیں عاشقی نہیں آتی

تمام شہر میں دھومیں مچیں گی قاتل کی
ہمارا کیا ہے ہمارا تو سر ہی جائے گا

.....

آصف ثاقب کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہے۔ پکے دھارمک، کم گو اور سوچ و بچار میں گم، دنیا و مافیہا سے یکسر بے نیاز، یہی سب کچھ ان کی غزل کے رگ و پے میں بھی دھڑکتا ہے۔ ان کی غزل رنگوں، خوشبوؤں اور دھلے ہوئے مناظر کی نئی نئی توسیں بناتی ہے۔ الفاظ کی پختہ بنت اور ماہرانہ استعمال سے وہ مکمل غزل گو لگتے ہیں۔ خوبصورت تراکیب، استعاروں اور علامتوں کو وہ اپنے اشعار میں نگینے کی طرح جڑتے ہیں۔ علم عروض کے بھی ماہر، لفظوں کی کھال اتارنے والے آصف ثاقب جب غزل کو لفظوں کا ہار پہناتے ہیں۔ تو اس کا رنگ و جمال کچھ اور دو آتشہ ہو جاتا ہے:

اشک اشک ندرت ہے، لفظ لفظ جدت ہے
ذوق ذوق بنتا ہے ذائقے بدلنے سے

خمیر گل میں ہے اقدام چوٹ کھانے کا
کہ شاخ جسم کی افتاد زخم والی ہے

جہاں آنکھیں لگائے دیکھتا رہوں
اسی کھڑکی کا شیشہ نم ہوا ہے

.....

آصف ثاقب کی غزلوں میں بحر ہزج

سالم کا استعمال کثرت سے ملتا ہے بلکہ اکثر شعرا کے ہاں یہ بحر زیادہ برتی جاتی ہے۔ شاید یہ بحر غزل کے لیے سب سے زیادہ مترنم اور روانی کے اعتبار سے عمدہ تسلیم کی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں جستجو اور اضطراب کی آمیختیت میں بھی وقار اور شائستگی کا رچاؤ ملتا ہے:

کھلے ہیں زخم نظر خون سے حنائی ہوئی
یہ کس مقام پہ آکر مجھ رہائی ہوئی

الٹ کے اس کو گرائے ہیں میں نے سب موتی
یہ آنکھ میرے لیے کاسۂ گدائی ہوئی

.....

ان کی غزل اگرچہ اپنے مزاج، ساخت اور معیار کے اعتبار سے کلاسیکی رنگ کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں جدید آہنگ کی جھلک، کھنک اور تازگی بھی ملتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ماہر غزل گو کبھی اپنی غزل کی ہیئت، انداز اور ارتقا کو اپنے عہد سے الگ نہیں کرتا۔ ان کا جدید انداز نہایت توانا ہے لیکن اس کا رنگ بے ساختہ اور فطری ہے۔ معاشی، سماجی اور سیاسی حالات پر وہ گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ معاشرتی المیوں اور سانحات کا نہایت رنج سے اپنے اشعار میں تذکرہ سمو دیتے ہیں:

کبھی ملنے کبھی کھونے لگے ہیں
مرے بیٹے جوان ہونے لگے ہیں

محل تعمیر کر رکھتے تھے امکانات کے ثاقب
حقیقت کی نظر سے ان کو جب دیکھا کھنڈر نکلے

.....

ہمارے سیاسی نظام کی خرابیوں اور لوگوں کی محرومیوں کی پرچھائیاں اور تفکرات کی لہریں ان کی غزلوں میں نہایت تسلسل سے چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ موجودہ ملکی سیاست سے وابستہ لوگوں سے مایوس ہو چکے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ آگے ایسے لوگ آئیں جو ان سے بہتر ہوں:

نئے سوار ہیں پر حوصلے پرانے ہیں
وہی پڑاؤ وہی راستے پرانے ہیں
انھیں اُتار کے اب عزتیں بچانی ہیں
ہمارے سر پہ جو بیٹھے ہوئے پرانے ہیں

.....

آصف ثاقب کی غزل بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ نئی تبدیلیوں کی سرنگوں سے آگے نکلنے کے لیے کوشاں ہے۔ شاعری میں تازہ مضامین کا راستہ کبھی بند نہیں ہوتا بلکہ باب سخن تا قیامت کھلا رہے گا۔ وہ دو ہزار سے زیادہ غزلیں کہہ چکے ہیں۔ ان کی ہر غزل کا اپنا ذائقہ اور الگ چاشنی ہے امید ہے کہ ان کی شاعری کی چمک اور بڑھے گی کیونکہ نمود نو کی مٹی کبھی خشک نہیں ہوتی:

نمود نو کے لیے خاک ہم بنے ثاقب
زمیں میں مل کے بھی اپنی انا نہیں بھولے

☆☆☆☆☆

سید فخر الدین بلے اور شہزاد احمد کی نصف صدی پر محیط داستانِ رفاقت

(ولادت: 16 - اپریل 1932 - امرتسر) (وفات: یکم-اگست 2012 - لاہور)

شہزاد احمد کے 10 ویں یوم وفات کے موقع پر خصوصی تحریر

شہزاد احمد نے جہاں بحیثیت شاعر اور محقق اور تنقید نگار کے حوالے سے اپنی صلاحیتوں کو تسلیم کروایا وہیں نفسیات اور فلسفہ کے موضوعات پر انتہائی اہم مضامین سپرد قلم کیے اور متعدد اہم ترین سائنسی موضوعات پر معروف کتب کے تراجم بھی ان کے نام کے ساتھ یادگار ہو چکے ہیں۔ اسلام اور فلسفہ ان کا محبوب موضوع ہے اور اس سلسلے میں ان کی تصانیف اور تراجم پاکستانی ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ شہزاد احمد صاحب نے سید فخر الدین بلے کی تحقیقی تصنیف۔ اسلام اور فنون لطیفہ ایک شاہکار تحقیقی تصنیف قرار دیا تھا اس حوالے سے شہزاد احمد کا مفصل تجزیاتی مضمون بے حد پسند کیا گیا۔ یہاں یقیناً اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا کہ شہزاد احمد کو انجمن ترقی ادب کا بہترین مضمون نویسی کا ایوارڈ 1958، نقوش ایوارڈ 1989 اور مسعود کھدر پوش ایوارڈ 1997 بھی مل چکا ہے۔ 'فنون'، 'اوراق'، 'سیپ'، 'ادب لطیف'، 'آواز جرس'، اور 'بیاض' جیسے معیاری ادبی جرائد اور رسائل میں شہزاد احمد صاحب مستقل بنیادوں پر شائع ہوا کرتے تھے۔

سید فخر الدین بلے کی زیر ادارت شائع ہونے والے 'آواز جرس' لاہور میں شہزاد احمد صاحب کی تخلیقات کو اہتمام سے شائع

ظفر معین بلے جعفری

کیا جاتا تھا اور سید فخر الدین بلے صاحب نے 'آواز جرس' میں شہزاد احمد کا خصوصی گوشہ بھی شائع فرمایا تھا۔ خالد احمد صاحب اردو غزل اور نظم، تنقید، تحقیق، صحافت، خطابت، ڈرامہ نگاری، اسکرپٹ رائٹنگ اور نعت گوئی کی دنیا میں ممتاز اور قابل رشک مقام پر فائز رہے اور ہیں۔ انھوں نے اب سے تیس برس قبل شاندار اور جاندار ادبی رسالہ ماہنامہ بیاض لاہور کتابی سائز میں شائع کرنا شروع کیا تو باوجود اس کے کہ اس وقت 'فنون'، 'اوراق'، 'محفل'، 'اقدار'، 'طلوع افکار'، 'آواز جرس'، 'ادب لطیف'، 'نیرنگ خیال'، 'سیپ' اور 'افکار' جیسے معیاری ادبی رسائل اور جرائد پہلے ہی سے دلدادگان شعر و ادب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے ماہنامہ بیاض، لاہور نے اپنا ایک مقام بنایا اور مواد، کاغذ، طباعت اور تزئین اور کتابت و کمپوزنگ کے اعلیٰ ترین معیار کو مسلسل تیس برس سے بلا کسی تعطل کے جاری رکھا ہوا ہے۔

قبلہ محترم خالد احمد کی زندگی میں بھی اور اس جہان فانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی۔ قبلہ خالد احمد صاحب نے اپنی رحلت سے چار برس قبل اپریل دو ہزار نو میں جناب شہزاد احمد کے ستترویں یوم ولادت کی مناسبت سے ماہنامہ بیاض کا شہزاد احمد نمبر شائع فرمایا تھا جو کہ بے شک ایک مکمل تاریخی دستاویز ہے۔ ماہنامہ بیاض کی پوری ٹیم نے ایک نئی تاریخ رقم کر دی۔ تیس سالوں میں "بیاض" کبھی بھی ایک روز بھی تاخیر سے شائع نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی ترسیل میں کبھی کوئی بھی رکاوٹ آئی۔

سلام ہے برادر محترم جناب عمران منظور صاحب، جناب نعمان منظور صاحب اور ان کے جملہ معاونین بشمول قابل صد احترام قبلہ اعجاز رضوی صاحب اور عزیزم ہاشم عمران اور اب تو خیر سے جناب نوید صادق، جناب جاہد احمد اور کنور امتیاز احمد جیسے مخلص اور ادب شناس اور تخلیق کار بھی 'بیاض' کی مجلس ادارت میں شامل ہیں۔ جناب عمران منظور صاحب نے حضرت خالد احمد کی تمام تر روایات اور اعلیٰ اقدار کو تسلسل کے ساتھ جاری اور زندہ رکھا ہوا ہے۔ انھوں نے متعدد اصناف اور شخصیات کے حوالے سے 'بیاض' کی بہت سی اشاعت خاص منظر عام پر لا کر وابستگان علم و ادب کو حیران کر دیا۔

سید فخر الدین بلے شاہ صاحب کی قائم کردہ ادبی تنظیم قافلہ کی تقریبات اور نشستوں کو

پڑاؤ کا نام دیا جاتا تھا۔ ہر ماہ کی یکم تاریخ بوقت پانچ بجے شام۔ غیر ملکی اور دیگر شہروں سے آئے ہوئے مہمانوں کے اعزاز میں خصوصی پڑاؤ ڈالے جاتے تھے۔ شہزاد احمد، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر اصغر ندیم سید، سرفراز سید، ڈاکٹر انور سدید، بیدار سرمدی، ظفر علی راجا، تسلیم احمد تصور، اشفاق نقوی، صدیقہ بیگم، سیما پیروز، قائم نقوی، پیروز بخت قاضی، ابصار عبدالعلی، اسلم کولسری، اسلم کمال، کلیم عثمانی، اسرار زیدی، طفیل ہوشیار پوری، ڈاکٹر حسن رضوی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر آغا سہیل، نورین طلعت عروبہ، سائرہ ہاشمی، بشریٰ رحمٰن، مرتضیٰ برلاس، علامہ شبیر بخاری علیگ، منور سعید (اداکار) اور دیگر بہت سے تخلیق کاروں کا شمار مستقل شرکاء قافلہ پڑاؤ میں ہوتا تھا۔

شہزاد احمد ہمیشہ بروقت بلکہ قبل از وقت پہنچ جایا کرتے تھے اور آتے ہی 'آواز جرس' کا تازہ شمارہ اٹھا کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا کرتے تھے۔ تازہ شمارے میں گزشتہ ماہ کی یکم اور خصوصی قافلہ پڑاؤ کی مفصل روداد اور اس میں پیش کی جانے والی متعدد بلکہ اکثر تخلیقات شائع ہوا کرتی تھیں۔ بعد ازاں ان کی والد گرامی قبلہ سید فخر الدین بلے شاہ صاحب سے کسی بھی موضوع پر گفتگو کا آغاز ہو جایا کرتا اور اس دوران مہمانان گرامی کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا۔

شہزاد احمد صاحب یکم تاریخ کو صرف اور صرف قافلہ پڑاؤ میں شرکت فرمایا کرتے تھے اگر کسی اور تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ بھی آتا تو ان سے معذرت کر لیا کرتے تھے۔ حضرت کنور جی مہندر سنگھ بیدی، جگن ناتھ آزاد، مجروح جی سلطان پوری، راجندر ملہوترا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، اختر الایمان، ڈاکٹر سید حامد، ڈاکٹر فوق کریمی، ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب، خمار جی بارہ بنکوی، ڈاکٹر ایس حسن ارمان نجمی، جوگندر پال، کرشنا دیوی اور دیگر غیر ملکی ادبی شخصیات کے اعزاز میں منعقدہ قافلہ پڑاؤ میں شامل اور شریک ہوتے یا مشفق خواجہ صاحب، شبنم رومانی صاحب، پروفیسر اقبال عظیم اور علامہ قبلہ طالب جوہری صاحب اور دیگر دیگر شہروں سے آئی ہوئی ممتاز شخصیات کے اعزاز میں منعقدہ قافلے کے جتنے بھی پڑاؤ ڈالے گئے ان میں سے اکثر میں شہزاد احمد صاحب نے اپنی تمام تر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر اپنی شرکت کو یقینی بنایا۔

☆☆☆☆☆

پاکستان کے نمائندہ شاعر... سعید الظفر صدیقی

سعید الظفر صدیقی کے فن پر اُردو دنیا کے جید ناقدین، مشاہیرِ ادب، اہلِ علم و ہنر اور صاحبِ اُسلوب شعرا نے اپنی اپنی مثبت آرا کا اظہار فرمایا ہے اور اُن کے فنِ شاعری کی گواہی دی ہے کہ وہ عہدِ موجود کے معتبر، صاحبِ اُسلوب اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اُن کے فنِ شاعری کا لوہا ماننے والوں میں ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر کامران، محسن اعظم محسن ملیح آبادی، پروفیسر جاذب قریشی، پروفیسر سحر انصاری، خالد شریف، رفیع الدین راز، ڈاکٹر اختر ہاشمی، پروفیسر یونس حسن، یوسف فضل، ڈاکٹر مظہر حامد، جاوید رسول جوہر، سلمیٰ صدیقی اور حمیدہ کشش شامل ہیں۔

سعید الظفر صدیقی کے کلام کو پڑھنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ ایک وسیع المطالعہ شاعر ہیں - اُن کی شاعری میں الفاظ کا چناؤ، دروبست، نئی زمینوں کی پیداوار، خیالات کی ندرت، لب و لہجہ کی جدت، تخیل کی بلند پروازی، جملوں کی بندش، نئی تراکیب کا استعمال، ردیف وقوافی کا انتخاب، محاورات کا برمحل جڑاؤ اور مانوس الفاظ کے ساتھ ساتھ غیر مانوس الفاظ کو شاعری کی تسبیح میں موتیوں کی طرح پرو دینا، اُن کے وسیع المطالعہ ہونے کا ثبوت ہے۔

سعید الظفر صدیقی میں ناقدانہ شعور بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ جانتے ہیں، کن خیالات کی ندرت سے کلام میں جان ڈالی جا سکتی ہے اور کن بیانات سے اشعار میں شعریت پیدا کی جا سکتی ہے۔ کن الفاظ سے اشعار کو زور فراہم کیا جا سکتا ہے۔ کون سے جملے اور محاورے قارئین کو دل سے واہ نکالنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ کن ضرب الامثال کا استعمال برمحل ہو سکتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کن اشعار میں آسان و سہل الفاظ سے اثر پیدا کیا جا سکتا ہے اور کن اشعار کو فصاحت و بلاغت کے ذریعے مؤثر بنایا جا سکتا ہے۔ اُن کو یہ بھی معلوم ہے کہ کون سی تراکیب دل میں نشتر بن کر اُتر سکتی ہیں اور کن تشبیہات و استعارات سے حسنِ سخن کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اُن کے

شاعر علی شاعر

کلام میں طنز کی کاٹ بھی موجود ہے اور بے حس و بے ضمیر لوگوں کے لیے تازیانے کی ضرب بھی شامل ہے۔ ان تمام باتوں نے اُن کی شاعری کو دوآتشہ بنا دیا ہے جس سے پڑھنے اور سننے والے پر ایک سحر کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اُن کے خیالات کی وسعت میں کھو جاتا ہے، یا اُن کے اشعار کے معانی و مفاہیم میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ اُن کی غزلیات میں سموئے ہوئے تصورات کے بحرِ بے کنار سمندر میں غوطہ زن ہوتا ہے اور پھر خود کو ساحل پر لاتا ہے تو متعدد معانی و مفہوم کے گوہرِ نایاب کو اپنی ملکیت بنا چکا ہوتا ہے اور خود کو ایک مشاق شناور سمجھنے لگتا ہے۔

سعید الظفر صدیقی کے وسیع المطالعہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ تاریخِ اُردو ادب پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ اُردو شاعری کے آغاز سے بھی واقف ہیں اور اس کے بدلتے ہوئے منظر نامے سے بھی آگاہ ہیں۔ اُن کو معلوم ہے کہ کس صدی میں کون کون سے شعرا منظرِ عام پر آئے اور اُنھوں نے سخن میں کیا کیا گل کھلائے اور کن کن تجربات سے اُردو شاعری کو ترقی دی اور بعد ازاں اِن میں سے فقط چند نام کیوں یادگار رہ گئے، باقی معدوم کیوں ہو گئے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں کن کن شعرا نے انفرادیت پیدا کی اور جدید لب و لہجہ کو اپنا کر اپنے لیے ایک الگ راہ متعین کی اور اپنے فن کی معراج پر پہنچے اور اپنی منزلِ مقصود کے حصول میں کام یاب و کامران ہوئے۔

سعید الظفر صدیقی ایک کلاسیک شاعر ہیں اور کلاسیک کی روح سے واقف ہیں۔ وہ شعروں میں خیالات کو سجا اور سنوار کر ضرور پیش کرتے ہیں مگر غزل کو ہزل بنانے کا کوئی عنصر اُن کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ وہ روایت سے جڑے ہوئے ہیں اور جدید لب و لہجہ بھی اپنائے ہوئے ہیں۔ اُن کا کلام روایت اور جدت کا حسین سنگم ہے اور یہی امتزاج اُن کا اُسلوب ہے۔ وہ ایسی نئی بات پیش کرتے ہیں جو ہر ذی شعور ذہن رکھنے والے شخص کے لیے قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اُن کا قاری ان کی خیال کی ندرت کو بآسانی محسوس کر سکتا ہے۔ اُن کے اکثر کلام میں امکانات کی بات ہوتی ہے جس سے ہم اُنھیں "امکانات کا شاعر" اور اُن کی شاعری کو "امکانی شاعری" تسلیم کر سکتے ہیں۔ وہ عہدِ موجود سے لے کر مستقبل قریب اور بعید کی بات تو کرتے ہی ہیں مگر اِس سے آگے کے امکانات بھی پیش کرتے ہیں۔

آج غالب کو ایک صدی کا شاعر تسلیم کر لیا گیا ہے اور اُردو ادب کے پانچ سب سے بڑے شاعروں میں غالب کا شمار ہوتا ہے تو اِس کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ غالب کی شاعری میں امکانات موجود تھے۔ اُنھوں نے سو سال بعد کے زمانے کی خبریں سو سال پہلے اپنی شاعری کے ذریعے دی ہیں۔ اسی طرح

سعید الظفر صدیقی کی شاعری میں بھی بعد اور مابعد زمانے کے امکانات ملتے ہیں جو، اُن کی شاعری کو دیگر ہم عصر شعرا کی شاعری سے منفرد بناتے ہیں اور اُن کو ہم عصر شعرا میں ممتاز کرتے ہیں۔

سعید الظفر صدیقی کے مزاجِ شاعرانہ میں اُردو ادب عالیہ رچا بسا ہوا ہے۔ اُن کا لہجہ شائستہ، زبان شستہ اور تخاطب کا انداز دل کو موہ لینے والا ہے۔ اُن کے یہاں فکری، فنی اور اُسلوبیاتی انفرادیت پائی جاتی ہے کیوں کہ اُنھوں نے اپنے شعری اثاثے میں حیات و کائنات کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ سمو دیا ہے۔ اُن کا شعری اثاثہ اُردو ادب کی تاریخ میں ایک گراں قدر اضافہ بھی ہے اور ایک وقیع سرمایہ بھی۔ اُن کے کلام میں معروضی و موضوعی دونوں طریقے موجود ہیں۔ اُن کا کلام موثرات و ادراکات کا شفاف آئینہ ہے۔ اُن کا کلام شعری جمالیات سے مزین ہے۔ ہر شعر میں شعریت کا پایا جانا، اُن کے کلام کا حسن اور زینت ہے اور یہی کسی بڑے ادب کی عمارت کا بنیادی پتھر ہوتا ہے جس سے بڑی سے بڑی اور خوب صورت اور دل کش عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔

سعید الظفر صدیقی کے یہاں ترقی پسندانہ شاعرانہ شعور بھی پوری توانائی کے ساتھ نظر آتا ہے مگر یہ وہ ترقی پسندانہ شعور نہیں ہے جو کسی تنظیم یا تحریک کے منشور کے طور پر لکھا گیا ہو۔ یہ وہ ترقی پسندانہ شعور ہے جس سے انسان کی سوچ، اُس کے خیالات و تصورات، اُس کے نازک احساسات، مختلف جذبات اور تلخ و شیریں تجربات کو ارتقا پذیر ہونے میں مدد ملتی ہے۔ اُن کی نظر میں ہر انسان میں اعلیٰ اخلاقی، روحانی اور انسانی اقدار و صفات موجود ہیں۔ وہ اپنی ذات کو اِن سے صیقل کر سکتا ہے اور خود کو ذلت و رسوائی اور پستی میں گرنے سے بچا کر اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کر سکتا ہے۔ وہ ترقی کر کے خود کو درندہ صفت لوگوں میں شمار کرنے کے بجائے خدا ترس اور انسانیت کی فلاح و بہبود کا رسیا بنا سکتا ہے۔ اِس نظریے نے اُن کی شاعری کو آفاقی بنا دیا ہے کیوں کہ دنیا کی تخلیق کا مرکز و محور انسان ہے، لہٰذا انسانیت کی بات کرنے والا شاعر آفاقی ہوتا ہے اور سعید الظفر صدیقی کی شاعری میں انسان اور اِس کی زندگی ہی پر بات کی گئی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو جس سے میرے دعوے کی دلیل مل جائے گی:

تمھارا شہر تو اب شہر ہے فرشتوں کا
ہمارے پاس ہیں کچھ آدمی کہاں لے جائیں

.....

آج پاکستان کے نمائندہ شعرا میں جو سعید الظفر صدیقی کا شمار ہوتا ہے تو اِس کی بنیاد عمدہ، سلیس، فصیح و بلیغ اور دل میں اُترنے والی شاعری ہے۔

سعید الظفر صدیقی عہدِ حاضر کے تمام شعری تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں اور بدلتے ہوئے میلانات و رجحانات سے بھی واقف ہیں اور اِنھیں اپنی شاعری کا موضوع بنا رہے ہیں۔ وہ

شاعری میں زبان و بیان اور اُسلوبِ تازہ کے ساتھ ساتھ فکر و مشاہدات، جذبات و احساسات پر خاصی دست رس رکھتے ہیں اور اپنے شعری آہنگ میں انفرادیت کے حامل ہیں۔ اُن کے مزاجِ شاعرانہ میں تلاش و جستجو کا عنصر شامل ہے۔ وہ سنی سنائی بات کو شعری قالب میں ڈھالنے کے قائل نہیں۔ اُنھوں نے اپنے عمیق مشاہدات، نازک احساسات، تلخ و شیریں تجربات اور شدید جذبات کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ اُن کے سوچنے کا انداز مدبرانہ ہے مگر اُن کا اندازِ تخاطب خطیبانہ ہرگز نہیں۔ اُن کی شاعری میں کہیں بھی وعظ و نصیحت نہیں ملتی۔ اِس خوبی نے بھی اُن کے کلام کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

سعید الظفر صدیقی کا مزاجِ سخن اپنے ہم عصر شعرا سے بڑی حد تک منفرد و ممتاز نظر آتا ہے کیوں کہ اچھے شاعر اور بڑی شاعری کے لیے جن شاعرانہ خوبیوں کا ہونا لازمی امر ہے، وہ اُن میں اور اُن کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں، جن کی وجہ سے وہ پاکستان کے نمائندہ شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں اور اُن کی شاعری بڑی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ ایسی شاعری کو دنیا کے منتخب ادب میں شامل کیا جانا ضروری ہے اور اِس کے دیگر زبانوں میں تراجم ہونے چاہئیں، تاکہ اُردو ادب کو عالمی سطح پر اعتبار حاصل ہو سکے اور اُردو شاعری کا معیار قائم رہ سکے۔

''موضوعاتِ قرآن انسائیکلوپیڈیا'' اسلامی اسکالر جناب سعید الظفر صدیقی کا ایک ایسا کارنامہ اور کارِ خیر ہے جس کا صلہ اُنھیں دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی اِس کی جزا دی جائے گی۔ ''موضوعاتِ قرآن انسائیکلوپیڈیا'' میں 1800 سو سے زائد موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اِس میں قرآن کے عربی متن کے ساتھ، مولانا فتح محمد جالندھری کا اُردو ترجمہ اور پھر پکتھال کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے، جس سے اِس کی عالمی سطح پر افادیت پیدا ہو گئی ہے۔ ''موضوعاتِ قرآن انسائیکلوپیڈیا'' افادیت اور اہمیت کے لحاظ سے ہر گھر اور ہر مسلمان کی فی زمانہ ضرورت ہے۔ اِس کی ضخامت 7000 صفحات پر محیط ہے اور یہ جہازی سائز کی 07 جلدوں پر مشتمل ہے۔ اِس پر پاکستان کی نام ور، معروف اور علمی و ادبی شخصیات نے اپنی مثبت آرا کا اظہار کیا ہے۔ یہ دنیائے اُردو ادب میں وقیع اضافہ بھی ہے اور اسلامی لٹریچر میں اپنی نوعیت کا منفرد کام بھی۔ اِس سے اسلامی ادب کا دامن مالا مال ہوگا اور یہ تاریخِ اُردو ادب کا روشن باب بھی ثابت ہوگا۔ اہلِ علم و ادب اسلامی اسکالر، کیمیا دان، شاعر و ادیب اور مؤلفِ ''موضوعاتِ قرآن انسائیکلوپیڈیا'' کو اِس قدر اہم اور وقیع کارِ خیر انجام دینے پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ آج سرکاری و نیم سرکاری اور نجی سطح پر جو ستائش اور ادبی انعامات واسناد سے نوازنے کا سلسلہ جاری ہے، وہ بڑی حد تک اثر ورسوخ پر قائم ہے۔ اِس کام میں شخصیت پرستی، عہدے سے مرعوبیت اور دوستیاں نبھائی جا رہی ہیں۔ عبقری، عظیم اور بڑے شاعروں کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے اور کیا جا رہا ہے، جس کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ سعید الظفر صدیقی اور ان جیسی متعدد قد آور ادبی شخصیات کو آج تک حکومت کی طرف سے کسی ایوارڈ یا سند سے نوازا نہیں گیا۔

سعید الظفر صدیقی کی ادبی خدمات اِس قدر زیادہ ہیں کہ اُنھیں اِس تخلیقی کام پر ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی جانی چاہیے۔ یہ ہمارے وطنِ عزیز کا سرمایہ ہیں۔ ایسے عبقری شاعر کی قدر ہر سطح پر کی جانا ضروری ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی عمرِ عزیز کا زیادہ تر حصہ اُردو ادب کے لیے صرف کر دیا ہے اور خود کو اُردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے وقف کر دیا ہے اور یہ بڑی دیانت داری، خلوص، لگن، محنت، یک سوئی، ذوق و شوق، باریک بینی، عرق ریزی اور ایمان داری سے اپنا تخلیقی فرض پورا کیے جا رہے ہیں۔ شعری سرمائے سے اہرِ ادب کے دامن کو مالا مال کر رہے ہیں۔ اُن کا شعری اثاثہ ایک وقیع سرمایہ ہے اور تاریخِ اُردو ادب میں اضافے کا باعث بھی ہے۔

"ماورائے آب و گل" جناب سعید الظفر صدیقی کی وہ کتاب ہے جس کا انگریزی ترجمہ Here Beyound Now And کے نام سے نیاگرا فال نیویارک (امریکا) سے 2011ء میں خوب صورت اور دیدہ زیب انداز میں شایع ہوا اور اس کی پچاس ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں اور بھاری رائلٹی بھی مصنف کو خراجِ تحسین کے طور پر پیش کی گئی۔ حال ہی میں "ماورائے آب و گل" کا تیسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ "ماورا بکس"، لاہور سے شایع ہوا ہے جو مارکیٹ میں دست یاب ہے۔

میری رائے کے ساتھ اُن اہلِ نقد و نظر کی آرا کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے جن سے اُردو ادب کی آبرو قائم ہے۔ سعید الظفر صدیقی کی شاعری اور اہلِ نقد و نظر کی آرا پڑھنے کے بعد یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ سعید الظفر صدیقی ایک عہد آفرین اور پاکستان کے نمائندہ شاعر ہیں، جن کو اُن کی اعلیٰ اور دل میں اُتر جانے والی شاعری کی بنیاد پر پاکستان بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ انھیں پڑھنا اور سننا چاہتے ہیں۔ اُن کے نمائندہ اشعار پوری دنیا میں سفر کر رہے ہیں اور وہ تحریریں، تقریریں اور مضامین اِس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں جن میں اُن کے اشعار کو زورِ بیان کے لیے کوٹ کیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ہائے وہ لوگ۔۔۔۔۔۔۔خوش کلام سے لوگ

ڈاکٹر اختر شمار محبتیں بانٹنے والے ایک خوبصورت شاعر ہیں۔انہیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ قدرت کے اپنے اصول اور قاعدے ہیں جن سے کسی کو مفر نہیں۔ بعض اوقات خصوصا موت کے معاملے میں اس کے فیصلے انسان کو اچانک حیران کر دیتے ہیں ۔بہر حال موت برحق ہے آج نہیں تو کل سب نے اس کا ایندھن ہو کر رہنا ہے۔ڈاکٹر اختر شمار جو کہ اعلیٰ پائے کے شاعر، ادیب، ماہر تعلیم، کالم نگار، افسانہ نگار اور ایک مخلص انسان تھے۔

جانے کس دیس جا بسے اختر
ہائے وہ لوگ خوش کلام سے لوگ

.....

لوگ لوگوں کے لیے شعر کہتے ہیں اختر شمار کا یہ شعر انہی پر صادق آتا ہے۔وہ ایک مخلص اور گداز دل رکھنے والے شخص تھے۔وہ محبتیں بانٹتے اور سمیٹتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے ہیں ان کی محبت پر ایک معرف زمانہ غزل ہے:

محبت بھی مصیبت ہے کریں کیا
مگر اپنی ضرورت ہے کریں کیا

ہمارے پاس اس لمحہ نہیں ہے
اسے فرصت ہی فرصت ہے کریں کیا

تجھے کھونے کا ڈر اپنی جگہ ہے
تجھے پانے کی حسرت ہے کریں کیا

شاہدہ دلاور شاہ

مسلسل دیکھنے سے مت خفا ہو
یہی اپنی عبادت ہے کریں کیا

ہمیں مرنا پڑا خوش فہمیوں میں
اسے ہنسنے کی عادت ہے کریں کیا

کوئی ماحول راس آتا نہیں ہے
جہاں جائیں اذیت ہے کریں کیا

ہم اس سے بچ کے چلنا چاہتے ہیں
مگر وہ خوبصورت ہے کریں کیا

ہمیشہ سچ نکل جاتا ہے منہ سے
کچھ ایسی ہی طبیعت ہے کریں کیا

ستم دل پر نہ کوئی ہم بھی سہتے
مگر اس کی حکومت ہے کریں کیا

.....

انہوں نے اپنی ساری زندگی تدریس کے ساتھ جوڑ دی اس سلسلے میں مصر کی جامعہ عین شمس اور جامعہ الازہر میں بھی پانچ چھ سال تک پاکستان کی نمائندگی کی۔ان کا آبائی گاؤں پنڈی کے قریب چکری سہال تھا۔ جب والد صاحب کا یہ سلسلہ روزگار ملتان تبادلہ ہوا تو آپ اپنی فیملی سمیت حسن آباد آن بسے۔اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے ایک دو ملازمتیں بھی کیں، ایک سکول میں کلرکی اور پولیس کے محکمے میں بھی دل نہ لگا کیوں کہ تخلیقی ادب کی بے چینی نے ایک جگہ رکنے نہ دیا۔ شعر و شاعری کا شغل انہیں ان کے استاد بیدل حیدری سے فیضیابی کے بعد لاہور میں لے آیا۔ان کے حلقہ احباب کی تعداد وسیع ہے جن میں کئی ایک کے ساتھ معاصرانہ چشمک رہی۔ کئی ایک پر خاکے لکھ کر ان کو ناراض بھی کر لیا کرتے تھے۔ڈاکٹر صاحب کی ایک یہ اچھی عادت تھی کہ ناراض شدہ دوستوں کو خود ہی منا بھی لیتے تھے۔اطہر ناسک مرحوم، باقی احمد پوری، مدثر بٹ، سعد اللہ شاہ، ڈاکٹر جواز جعفری، ناصر بشیر، گل نوخیز اختر، عرفان صادق، نوشی گیلانی، ڈاکٹر صغریٰ صدف، صوفیہ بیدار، آفتاب خان، راجہ نیر اور ڈاکٹر تنویر حسین ان کے مزاج کو خوب سمجھتے تھے۔ڈاکٹر صاحب اپنی فیملی لائف میں تو بہت پرسکون تھے مگر میدان سخن میں کچھ بے چینیاں ساری زندگی ان کے ہم رکاب رہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب پرائڈ آف پرفارمنس کے حق دار تھے جو ان کو ان کی زندگی میں نہ مل سکا۔لاہور میں کئی دوسرے شہروں سے آئے ہوئے لکھنے پڑھنے والے ان کے دوست بنے۔ کچھ ان کے پرانے دوست جو دوسرے شہروں میں رہتے ہیں، نے بھی اپنے اپنے مقام پر شہرت پائی جن میں رضی الدین رضی، شہزاد سلیم، قمر رضا شہزاد اور

تابش الوری جیسے معروف شاعر بھی شامل ہیں۔ لاہور میں اختر شمار ادبی مسائل کے بڑے محاذوں پر ڈٹے رہے۔ ان کے بیباک آمد نے شہرت کے ڈونگرے ان کے دامن میں لا جمع کیے۔ ان کا شمار اردو ادب کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے بہت سے اشعار زبان زد عام ہیں۔ ان کے عہد میں یہ شرف صرف اختر شمار، فرحت عباس شاہ، عباس تابش، منصور آفاق اور وصی شاہ کے حصے میں آیا ہے کہ ان کی حیات میں ہی ان کے اشعار عوامی درجہ اختیار کر لیں۔ ان کی ۳۰ سے زائد کتب منصہ شہود پر آ چکی ہیں اختر شمار کا تخلیقی سفر چار دہائیوں پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بی اے ملتان سے کیا اور ایم اے اردو اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور سے کیا۔ انہوں نے تدریسی فرائض کا آغاز قصور کالج سے کیا۔ اس کے بعد جی سی کالج لاہور اور پھر تادم آخر ایف سی کالج یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے متمکن رہے۔ انہوں نے ''حیدر دہلوی :احوال و آثار'' کے عنوان سے خواجہ محمد زکریا کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا۔ اسی کی دہائی کے اواخر میں انہوں نے مختلف رسائل اور اخبارات میں کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی انجمن ترقی اردو کراچی سے بھی خاص یاد اللہ رہی۔ ابھی تک ان کے تخلیقی کام پر مختلف یونی ورسٹیوں سے پانچ چھ تحقیقی مقالہ جات رقم ہو چکے ہیں۔ ان کی پیدائش پاک پتن شریف میں ہوئی اور تدفین ان کے آبائی گاؤں چکری سہال میں ہوئی۔ ان کی تصانیف میں روشنی کے پھول، کسی کی آنکھ ہوئے ہم، ابھی آغاز محبت ہے، جیون تیرے نام، ہمیں تیری تمنا ہے، آپ سا کوئی نہیں، تنہا میری محبت ہو، دھیان، عاجزانہ، اکھیاں دے وچ دل، میلہ چار دیہاڑے، پنجابی ادب رنگ، برتری ہری ایک عظیم شاعر، میں بھی پاکستان ہوں، ہم زندہ قوم ہیں، لاہور کی ادبی ڈائری، موسی سے مرسی تک، جی بسم اللہ وغیرہ ہیں۔ ان کی کلیات ''اختر شماریاں'' کے نام سے چھپی تھی۔ انہوں نے حمد، نعت، سلام، منقبت و مناجات، غزل، نظم، گیت، ترانے، دوہڑے وغیرہ جیسی معتبر اصناف میں بسیرا کیا۔ وہ نو محرم الحرام ۸ اگست دو ہزار بائیس کو دار فانی سے باسٹھ سال کی عمر میں رخصت ہوئے۔ وہ عارضہ جگر میں مبتلا تھے۔ بڑے صابر آدمی تھے اتنے سیف میڈ کہ کبھی اشد ضرورت کے وقت بھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے وہ ''ہمیشہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے'' والی حدیث پر عمل پیرا رہے۔ اکثر غریب ادیبوں کی چپکے سے مدد کر دیتے کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی پھر ان سے کبھی صلے کے متمنی نہیں رہے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے بہت جدوجہد کی ان کے اندر صوفیانہ خو اور آرزو تھی۔ ان کا شعری سفر تو

ان کی تقریباً ساری زندگی پر محیط ہے مگر ان کی گفتگو اور نثری تحریروں میں اپنے مرشد (جو کہ ہری پور کے باسی ہیں) سے والہانہ، دلبرانہ، صوفیانہ، بے باکانہ اور بے لوث عقیدت ٹپکتی تھی۔ ان کے کالموں میں اشفاق احمد کی طرح ایک بزرگ یا بابا جی ہوتے تھے جن سے زندگی کو سدھارنے کا سلیقہ ملتا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ حرف کا پاس تھا شاعری انہیں اپنی جان سے بھی عزیز تھی مگر آپ یہ جان کر انگشت بدنداں ہوں گے کہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے شعر سے بھی زیادہ پیارا اپنے مرشد پیر جی سے تھا۔ جب کبھی ان کے مرشد کا تذکرہ چھڑ جاتا تو ڈاکٹر صاحب کا رنگ پہلے بھی سرخ سفید تھا، وہ مزید سرخ ہو جاتا چہرے پر عقیدت کا نور پھیل جاتا اور پلکوں پر محبت کے دیپ جل اٹھتے۔ اس سچی لگن کا نتیجہ یہ تھا کہ اپنی وفات سے چند ہی دن قبل وہ باقاعدہ مرشد کے ڈیرے کا طواف کرنے گئے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے پیر و مرشد سید شبیر حسین شاہ رحمت اللہ علیہ سے وصال کے راز و نیاز کرنے گئے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد کا منظر اس کی تصدیق کرتا ہے کہ جب ان کو ان کے آبائی قبرستان چکری سہال میں دفن کر دیا گیا تو دوسرے تیسرے دن بعد وہ ہری پور کے احباب، ان کے پنڈی کے احباب اور ان کے بڑے صاحبزادے تیمور خان کے خواب میں ڈاکٹر صاحب آ کے کہتے ہیں کہ وہ پنڈی کی آرام گاہ میں خوش نہیں ہیں وہ ہری پور اپنے پیر کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ یوں یہ بات آن دی ریکارڈ ہے کہ ان کی دوبارہ قبر کشائی کی گئی ان کے جسد خاکی کو وہاں سے نکال کے ہری پور لے جا کر تیسرا جنازہ پڑھایا گیا۔ کسی ہستی سے والہانہ جڑت کو ادبی زبان میں عشق کا نام دیا گیا اور سچے عشق کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پارسائی، حیاداری اور خود انحصاری کی زندگی بسر کی۔ ان کا کبھی کوئی سکینڈل سامنے نہیں آیا کیوں کہ وہ ہر شخص کو اس کے مقام کے مطابق جگہ دیتے اور ایک بڑی یونی ورسٹی میں ہوتے ہوئے بھی جہاں کبھی نہ کبھی کسی کا بھلے ہلکا اور کمزور سا ہی سہی، اسکینڈل لوگ ضرور بنا دیتے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں بھی سرخرو ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ ان کی ایک عادت تھی کہ وہ اپنے جونیئرز کی بہت ہی احسن طریقے سے راہنمائی فرما دیتے۔ تمام بڑے شاعر غم دوراں اور غم جاناں کا شکار رہے ہیں۔ اختر شمار کی شاعری بھی ان دونوں کے کرب سے لبریز ہے۔

تجھے میں مل نہ پایا وقت رخصت
جیوں گا جب تلک یہ غم رہے گا

دیکھے کسی کو ایک جھلک اور اس کے بعد
پہروں کسی کو بیٹھ کے سوچا کرے کوئی

کاغذ پہ یہ اشعار ہیں یا خون کے چھینٹے
یا رنگ پہ آیا ہوا --- فن کار کا دکھ ہے

ایک جیسے تھے سبھی اس شہر میں
مجھ کو سب سے مختلف ہونا پڑا

کہاں رکے ہیں اب بھی یزیدوں کے ظلم و ستم
ہمارے سامنے کشمیر ---- کی کہانی ہے

.....

ڈاکٹر اختر شمار بنیادی طور پر ایک استاد تھے اور اپنے بعد آنے والوں کی حوصلہ افزائی اپنے فرائض کا حصہ گردانتے تھے۔ ہمیشہ کہتے کہ پڑھانے والے میں اور کوئی خوبی ہو نہ ہو اسے استاد اچھا ہونا چاہیے کیوں کہ وہ قوم کی نسلوں کے معمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر شمار خود بھی ایک اچھے مدرس تھے۔ ان کے تلامذہ ان کی کلاس کا بے چینی سے انتظار کرتے۔ انہیں اپنے سبجیکٹ پر مکمل گرفت تھی۔ وہ ادب، ادیب اور اپنے گرد و پیش میں معاصرانہ چشمک کے معاملات سے بھی خوب واقف تھے۔ ایک مرتبہ کسی ادبی تقریب میں وہ ایک خوبرو شاعرہ کے پاس کھڑے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر از راہ تلذذ، دو عورتیں ان کے پاس آئیں اور تقریباً پورا گھنٹہ انہیں سمجھاتی رہیں کہ یہ نئی نئی لڑکیاں یوں ہی ادب میں شوقیہ آ جاتی ہیں ادب سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا جب ان کا شغل پورا ہو جاتا ہے تو جلد یا بہ دیر ادبی منظر نامے سے غائب ہو جاتی ہیں، ڈاکٹر صاحب! متذکرہ شاعرہ سے بچ کے رہیے گا۔ ڈاکٹر صاحب حسب عادت مسکرائے اور انہیں باور کرایا کہ جو آپ سمجھ رہی ہیں ایسا کچھ نہیں وہ میری پڑھی لکھی کولیگ اور صاحب دیوان شاعرہ ہے۔ اس پر وہ دونوں خائف ہو کر چلتی بنیں۔ ڈاکٹر صاحب سوجھ بوجھ کے آدمی تھے اور زمانے کی اونچ نیچ کو برابر سمجھتے تھے۔ وہ صاحب اسلوب تخلیق کار اور ایک مجلسی آدمی تھے۔ ان کے پاس ہمہ وقت کوئی نہ کوئی شاعر ادیب ضرور ادب و فن پر گفتگو کر رہا ہوتا۔ آخری کچھ مہینوں سے وہ اپنے پرانے دوستوں منصور آفاق، شفیق احمد خان اور ڈاکٹر غافر شہزاد کے پاس کافی وقت گزارنے لگے۔ یونیورسٹی سے اٹھتے تو ان کا دوسرا مسکن مجلس ترقی ادب تھا۔ جہاں ہفتہ وار بڑے مشاعرے کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف اور سینئر ادیبوں کے ساتھ شامیں ہوتیں، اکثر میں ڈاکٹر صاحب شرکت فرماتے۔ وہاں کچھ دیگر دوستوں سے بھی ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ وہیں وہ اپنے پرانے دوست صابر رضا اور محمود پاشا سے بغلگیر ہو کر بے انتہا خوش ہوئے۔ انہیں اس بات کا بھی ملال تھا کہ سوشل میڈیا نے ادیب اور تخلیق کار کو نقصان پہنچایا ہے اب لوگ محنت کی بجائے شہرت پر یقین رکھتے ہیں یہ سستی

اور جعلی شہرت اور رات و رات وائرل ہونے کی خواہش پڑھنے لکھنے کے عمل اور حقیقی ہنر کی مسابقت کو بڑی تیزی سے برباد کر رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ شعر کو لکھ کر میدان میں رکھ دینا چاہیے اس میں جان ہو گی تو زندہ رہ جائے گا۔ وہ مشاعرے میں پہلا مصرع پڑھتے تو سامعین اگلا مصرع دھرا دیتے۔ ان کے چند اشعار دیکھیے:

ذرا سی دیر تھی بس اک دیا جلانا تھا
اور اس کے بعد فقط آندھیوں کو آنا تھا

میں گھر کو پھونک رہا تھا بڑے یقین کے ساتھ
کہ تیری راہ میں پہلا قدم اٹھانا تھا

وگرنہ کون اٹھاتا یہ جسم و جاں کے عذاب
یہ زندگی تو محبت کا اک بہانہ تھا

یہ کون شخص مجھے کرچیوں میں بانٹ گیا
یہ آئینہ تو مرا آخری ٹھکانہ تھا

پہاڑ بھانپ رہا تھا مرے ارادے کو
وہ اس لیے بھی کہ تیشہ مجھے اٹھانا تھا

بہت سنبھال کے لایا ہوں اک ستارے تک
زمیں پہ جو مرے عشق کا زمانہ تھا

ملا تو ایسے کہ صدیوں کی آشنائی ہو
تعارف اس سے بھی حالاں کہ غائبانہ تھا

میں اپنی خاک میں رکھتا ہوں جس کو صدیوں سے
یہ روشنی بھی کبھی میرا آستانہ تھا

میں ہاتھ ہاتھوں میں اس کے دے نہ سکا تھا شمار
وہ جس کی مٹھی میں لمحہ بڑا سہانا تھا

اس کے نزدیک غم ترک وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں

اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں
اس کو کھو کر تو مرے پاس رہا کچھ بھی نہیں

چار دن رہ گئے میلے میں مگر اب کے بھی
اس نے آنے کے لیے خط میں لکھا کچھ بھی نہیں
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں

دشمنی کر مگر اصول کے ساتھ، مجھ پہ اتنی سی مہربانی ہو
میرے معیار کا تقاضا ہے، میرا دشمن بھی خاندانی ہو

اپنے پیر و مرشد کے نقش قدم پر وہ اللہ رسول اور ان کی آل سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ نبی آخر الزماں سے ان کی عقیدت کسی سے

ڈھکی چھپی نہ تھی ان کا یہ شعر دیکھیے:

میں گزرتا تو وہاں جاں سے گزرتا چپ چاپ
یہ ہوا کیسے مدینے سے گزر جاتی ہے

ڈاکٹر صاحب ایک مخلص پاکستانی اور محبِ وطن تھے۔ سماج میں پنپنے والی خرافات کا بھی ان کے دل پر ایک بوجھ تھا۔ وہ کہتے ہیں:

ریزہ ریزہ ہونے لگا ہوں میں ہر پل
کھا جائیں گے مجھ کو پاکستان کے دکھ

ساری خلقت ایک طرف تھی اور دوانہ ایک طرف
تیرے لیے میں پاؤں پہ اپنے جم کے کھڑا تھا ایک طرف

ایک اک کر کے ہر منزل کی سمت ہی بھول رہا تھا میں
دھیرے دھیرے کھینچ رہا تھا تیرا رشتہ ایک طرف

دونوں سے میں بچ کر تیرے خواب و خیال سے گزر گیا
دل کا صحرا ایک طرف تھا آنکھ کا دریا ایک طرف

آگے آگے بھاگ رہا ہوں اب وہ میرے پیچھے ہے
اک دن تیری چاہ میں کی تھی میں نے دنیا ایک طرف

دوسری جانب اک بادل نے بڑھ کر ڈھانپ لیا تھا چاند
اور آنکھوں میں ڈوب رہا تھا دل کا ستارہ ایک طرف

وقت جواری کی بیٹھک میں جو آیا سو ہار گیا
اختر اک دن میں بھی دامن جھاڑ کے نکلا ایک طرف

.....

ڈاکٹر صاحب عادتاً ذرا زود رنج بھی رہتے تھے کہ ان کو انکا جائز مقام نہیں ملا۔ ہمیشہ انہیں حفظ مراتب کا خیال رہتا۔ وہ بہت حساس انسان تھے۔ اس کے باوجود بھی سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ اکثر کہتے کہ زندگی مختصر سی ہے ہم نے اور کتنا طویل جینا ہے لہٰذا دوریاں اور کدورتیں ختم ہونی چاہیں۔ ان کا ایک شعر اس خیال کی غمازی کرتا ہے:

مت کسی کا گلہ کرو بھائی
سب پہ راضی رہا کرو بھائی

.....

بہر حال ڈاکٹر صاحب نے اپنی تدریسی، صحافتی اور ادبی و تخلیقی زندگی کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ ان کی اچانک وفات نے ان کے سب چاہنے والوں کو غمزدہ کر دیا ہے۔ اجل کو کون روک سکتا ہے۔ آخر میں ان کے دوستوں کی طرف سے ان کا اپنا ہی ایک شعر ہے:

میں کیا کہوں کہ کیسی تھی وہ شام الوداع
میں دیکھتا رہا تھا ---- بلایا نہیں اسے

وقت نے تو یہی سکھایا شمار
آج ہے آج ، کل نہیں کوئی

.....

رب دنیا و آخرت سے دعا ہے کہ وہ اختر شمار کے درجات بلند کرے اور انہیں آسودہ رحمت فرمائے --- آمین ثم آمین

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر اختر شمار ___ ایک سنہری عہد کا اختتام ہوا

ذرا سی دیر تھی بس اک جلانا تھا
اور اس کے بعد فقط آندھیوں نے آنا تھا

یہ کون شخص مجھے کرچیوں میں بانٹ گیا
یہ آئینہ تو مرا آخری ٹھکانہ تھا

ابھی سفر میں کوئی موڑ بھی نہیں آیا
نکل گیا ہے یہ چپ چاپ داستاں سے کوئی

.....

حیات و ممات، وصال و فراق کے سلسلے انسانی زندگی کے لازمی جزو ہیں۔ ہم تعلق اور رشتے کی بنیاد پر انتقال کر جانے والی شخصیت کی جدائی کے کرب تو محسوس کرتے ہیں جو ہماری زندگی میں جتنا اہم ہوگا اور جتنا دل کے قریب ہوگا اس کے جانے کا اتنا ہی دکھ اور ملال ہوگا۔ ڈاکٹر اختر شمار اُن شخصیات میں شامل تھے جو ہمارے دل کے بہت قریب تھے ان سے ہمارا رشتہ اور تعلق خاص تھا اس لیے ان کے انتقال کی خبر ہم پر بجلی کی طرح گری اور دل کی بستی کو ویران کر گئی۔ کچھ دن تو سمجھ ہی نہیں آئی کہ کتنا بڑا سانحہ تھا جو رونما ہو چکا کیونکہ کوئی جتنا نزدیک ہوتا ہے اس کی موت کا اُتنی دیر سے یقین آتا ہے۔ اب بھی ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اچانک اس ہال میں داخل ہوں گے اور ہمیں کہیں گے کہ:

فیصل زمان چشتی

اس کے نزدیکِ غمِ ترکِ وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے جیسے کہ کچھ بھی نہیں

.....

لیکن ہمارے دل سے اب مسلسل یہی صدا آرہی ہے کہ:

اس کو کھو کر تو مرے پاس رہا کچھ بھی نہیں

.....

ڈاکٹر اختر شمار راہِ سلوک کے مسافر تھے وہ روحانی تجربات و مشاہدات کے جہان میں رہنا پسند کرتے تھے ان کو یہ معلوم تھا کہ جب عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی میں ڈھل جائے جس میں فنا ہو کر انسان جب اپنی ذات کو جاننے اور خودی کے اسرار و رموز کو پہچانتا ہو تو وہ کیفیت انسان کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ انھوں نے روحانی مشاہدات سے معرفت کی گرہیں کھولیں اور طریقت کے راز آشکار کیے وہ حکمت و دانائی اور تصوف کی اُن راہوں کے مسافر تھے جس کی مسافت اور منزل عام آدمی کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے اس کو پانے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے سفر و مشقت کی شدتیں جھیلنا پڑی ہیں تب جا کر اُن راستوں کی گرد انسان کے نصیب میں آتی ہے۔

وہ بنیادی طور پر روحانیت کی بستی کے مکین تھے، ان کی کتابوں میں خالص روحانی تجربات کو پڑھ کر انسان اپنے اندر ایک اضطرابی کیفیت محسوس کرتا ہے اور ایک بے کلی کی حالت وارد ہو جاتی ہے اور قاری وہ سب کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے جو عام آنکھ سے مخفی ہوتا ہے اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

بڑے تھے ہم بھی جہاں روشنی میں بکھرے ہوئے
کئی ستارے ملے اُس گلی میں بکھرے ہوئے

.....

ڈاکٹر اختر شمار نے اپنی تحریروں سے ہمیں اصل منزل اور حقیقت و معرفت کی سمت لے جانے کی کوشش کی ہے وہ کہتے تھے کہ اگر انسان کو اپنی ہستی کا ادراک ہو جائے، دنیا میں آنے کا راز پالے تو انسان ہر جلال و جمال و کمال کی وہ حالتیں اور کیفیتیں منکشف ہونے لگتی ہیں جو کہ خودی کا سرِ نہاں ہیں اسی لیے تو انھوں نے یہ بات کہتے ہوئے خوشی اور اطمینان محسوس کیا کہ:

عہدِ شباب میں جو یہ پسند کی آزاد رہ کے ہم نے اسیری پسند کی
شاہی بھی سامنے تھی مقدر کی راہ پر
اختر شمار ہم نے فقیری پسند کی

.....

ڈاکٹر اختر شمار کا شمار اُردو ادب کی اُن چنیدہ شخصیات میں ہوتا ہے جن کا علمی و ادبی قد کاٹھ نہایت بلند ہے انھوں نے غزل و نظم اور نثر میں وہ مقام و مرتبہ حاصل کیا جو کہ ہر ادیب کا خواب ہوتا ہے۔ اور اس مقام و مرتبے کے پیچھے ان کی شب و روز کی سخت محنت اور ریاضت شامل تھی۔ درس و تدریس کا شعبہ اُن کو اپنے مرشد کی دعا و عطا تھا۔ انھوں نے اُردو اور پنجابی دونوں میں لکھا اور کمال لکھا۔ تحقیق و تنقید، کالم نگاری، شاعری اور نثر ہر شعبے میں کمال دکھایا ان کی دو درجن سے زائد کتب اردو ادب کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ اُن کی زندگی کے انداز و اطوار کا پتہ ان کے اس شعر سے بخوبی ہوتا ہے کہ:

ہم نے کبھی نے چیز اُٹھائی پڑی ہوئی
قدموں میں تھی اگرچہ خدائی پڑی ہوئی

ایک اور شعر جو ان کی پہچان بن گیا:

میرے معیار کا تقاضا ہے
میرا دشمن بھی خاندانی ہو

.....

اُردو شاعری میں ان جیسا منفرد لہجہ کم کم شعرا کرام کو نصیب ہوا ہے۔ ان کے اشعار کا مزاج بھی ان کی شخصیت کی طرح دبنگ ہے۔ ایک طویل علمی و ادبی سفر طے کر کے یہاں تک پہنچے۔ انھوں نے زندگی کی مسافت میں مشکلیں اور صعوبتیں برداشت کیں لیکن ثابت قدم رہے کیونکہ وہ راہِ سلوک کے مسافر تھے اور ان کے جمال میں جلال تھا اور جلال میں جمال پنہاں تھا۔

ان کی زندگی ان کے دوست احباب کے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند ہے اس میں سے ہم جو صفحہ پڑھ لیں وہ خوبصورت اور اُجلا ہی ملے گا۔

اختر شمار ایک عہد کا نام ہے جس میں رنگ بھی ہیں پھول بھی ہیں خوشبو بھی ہے خوشی بھی ہے اُداسی بھی ہے حسن و جمال بھی ہے جاہ و جلال بھی ہے اوج و کمال بھی ہے محبتیں بھی ہیں چاہتیں بھی ہیں غرضیکہ وہ سب کچھ جو ہونا چاہیے وہ ہمیں ملتا ہے۔ ہم اختر شمار کے عہد میں ان کے ہمرکاب رہے اور یہ ہمارا سرمایہ افتخار ہے۔ اب ہم اپنی پوری زندگی اُن کی محبتوں، جلوتوں اور صحبتوں کو یاد کرتے رہیں گے۔ آخر میں ان کے دو اشعار:

اک ستارے کی رفاقت جو میسر ہوتی
یہ جو گردش ہے مرے پاؤں کی ٹھوکر ہوتی
کیا کہوں تجھ کو اے سمٹی ہوئی پایاب ندی
تو مجھے چھو کے گزرتی تو سمندر ہوتی

☆☆☆☆☆

ایک متاثر کن۔۔۔ متحرک شخصیت۔۔۔ ڈاکٹر عبدالکریم شکور

فیصل آباد سے جناب شہزاد بیگ کا فون آیا اور وہ مجھے کہنے لگے کہ برطانیہ سے مشہور علمی ادبی شخصیت ڈاکٹر عبدالکریم شکور پاکستان تشریف لا چکے ہیں اور میں ان کے اعزاز میں ایک محفل رکھنا چاہتا ہوں۔ علاوہ ازیں شہزاد بیگ نے اس پروگرام کی میزبانی کرنے کی پیشکش مجھے کی۔ جس کو میں نے کچھ تفصیلات جاننے کے بعد قبول کیا۔

شہزاد بیگ نے ڈاکٹر صاحب کا جو تفصیلی تعارف مجھے بھیجا وہ مجھے انگشت بدنداں کرنے کے لیے کافی تھا۔۔۔ آپ بھی وہ تعارف ملاحظہ فرمائیے:

ڈاکٹر صاحب گزشتہ تیس سال سے میڈیکل کے شعبے سے وابستہ اور برطانیہ میں مقیم ہیں۔ مینٹل ہیلتھ اور ڈیمینشیا کے مریضوں پر کام کرتے ہیں۔ اکیلے بیٹھ کر سوچنا آپ کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ جس سے پہلی محبت ہوئی اس سے شادی نہیں ہو سکی۔ آپ نے ہندوستان اور پاکستان کے پچاس مزارات کی زیارت کی ہے اور اللہ کے ولی نامی کتاب لکھی۔ پھر ایک رات مصر کے اہرام میں گزاری اور مقالہ لکھا۔ علاوہ ازیں فرعون کے مقبرے میں رات گزارنے کا شرف بھی حاصل کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے رئیس امروہوی کے ساتھ کئی سفر کیے اور پیرا سائیکالوجی یعنی جنات اور جادو وغیرہ پر کام کیا۔ سادھوؤں کے آشرم میں کئی مہینے گزارے اور ان پر مقالے لکھے۔

مشہور زمانہ شاعر جون ایلیا کے ساتھ زندگی کا کافی عرصہ گزارا جس کو وہ اپنی زندگی کا سرمایہ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سات زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ ادب شناس بھی ہیں اور چہرہ شناس بھی۔ مولانا مودودیؒ کے ساتھ بھی وقت بتایا۔ برطانیہ کی ملکہ نے آپ کو MBE ایوارڈ یعنی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے بھی نوازا ہے۔ آپ کی جو کتب منظر عام پر آ چکی ہیں ان کے نام کچھ یوں ہیں:

اسلام اور مغربی دنیا

تو کیسا

حج اور عمرے کے مسائل

خبردار

سیدہ آمنہ ریاض

ھمزہ اور زویا
فیس بک کی شاعری
ابلیس کی مجلس شوریٰ تشریح

پروگرام کے نوٹس بناتے ہوئے میں یہ سوچنے لگی کہ ڈاکٹر صاحب شائد سونڈ بونڈ ہوں گے۔ گلے میں ٹائی اور ہاتھ میں مہنگی گھڑی باندھی ہوگی اور کسی کو کم ہی خاطر میں لائیں گے۔

خیر وقت مقررہ پر میں آرٹس کونسل پہنچ گئی۔ جہاں تھوڑی ہی دیر بعد ڈاکٹر عبدالکریم شکور مع ڈاکٹر سعادت سعید تشریف لے آئے۔

رسمی سلام دعا کے بعد سب اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد ڈاکٹر عبدالکریم شکور اپنی نشست سے اٹھ کر میرے برابر والی نشست پر بیٹھ گئے اور گفتگو شروع کی۔

میں نے ڈاکٹر عبدالکریم شکور کریم صاحب کا جو ذہنی خاکہ بنایا تھا وہ ان کو دیکھتے ساتھ ہی کہیں اڑن چھو ہو گیا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب انتہائی ملنسار، سادہ اور شفیق طبیعت کے مالک ثابت ہوئے۔ پروگرام شروع ہونے سے پہلے وہ میرے برابر آ کر بیٹھ گئے جس سے ان کے ساتھ پہلی مرتبہ ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کیا۔

ڈاکٹر صاحب میں کسی قسم کی ظاہرداری اور نمود و نمائش نام کو نہیں تھی۔

میرے ذہن میں بے ترتیب سوالات کا ایک سمندر تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔۔۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروعات کروں۔ شائد ڈاکٹر صاحب اس تجسس کو بھانپ گئے اور خود بہ خود ہی تفصیلات اس خوبصورتی سے بیان کرنے لگے کہ ہر سوال کا جواب خود ہی میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

پروگرام کمال خوبصورتی سے اپنے اختتام کو پہنچا اور ہم نے رسم دنیا اور موقع دیکھ کر کہ ڈاکٹر صاحب پھر کہاں ہاتھ لگیں گے، فوری اگلے دن ادب سرائے کے زیر اہتمام شام منانے کی پیشکش کی جس کو انہوں نے من و عن قبول کیا۔

اگلے ہی دن ڈاکٹر صاحب ہمارے غریب خانے پر وعدے کے مطابق تشریف لائے۔ جہاں ان کے ساتھ کافی وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی شگفتہ مزاج انسان واقع ہوئے ہیں۔ بات بات پر چٹکلے چھوڑنا اور محفل کو کشت زعفران بنانے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ ماہر نفسیات ہیں اس لیے انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں سے کمال آگاہی رکھتے ہیں۔

آپ کی شاعری مزاح اور سنجیدہ دونوں اصناف میں موجود ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے آپ جس بھی موضوع پر بات کر لیں آپ بیزار نہیں ہوں گے۔ سچ پوچھیں تو ڈاکٹر صاحب ایک ایسی دلچسپ کتاب کی مانند ہیں جس کو پڑھتے پڑھتے قاری بور نہیں ہوتا اور تجسس کا مادہ آخر دم تک موجود رہتا ہے۔

چاروں مسالک کے عقائد ازبر ہیں لیکن کٹریت نام کو نہیں ہے۔ سادگی کمال ہے۔ آپ کے پاس بیٹھنے والا خود کو چھوٹا محسوس نہیں کر سکتا۔ ہر کسی سے انتہائی عاجزی اور ادب سے ملتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے مختصر سے عرصے میں، میں کیسے کسی شخص کو پہچان سکتی ہوں؟

اس کا جواب ڈاکٹر صاحب کا وہ سلیس و سادہ کلام ہے جو کہ ان کی شخصیت کا مظہر ہے۔ کسی بھی شخص کے فن پارے کو دیکھ کر اس کی شخصیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو لگایا جا ہی سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان ہی کی طرح آسان الفاظ پر مشتمل ہے۔ جون ایلیا کی رفاقت نے ان کی شاعری پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ آپ چھوٹی بحروں میں زندگی کے بڑے مضامین باندھنے کا ہنر جانتے ہیں۔ مزاح کی بنت کچھ اس طرح ہے کہ سننے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اکثر شعروں کے دو معنی نکلتے ہیں۔ آپ جس انداز میں شعر کو پرکھنا چاہیں گے ویسا ہی مزہ پائیں گے۔

محفل کے اختتام پر تمام مہمانوں کو عشائیہ پیش کیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کیا رات کا کھانا، کھانا ان کے روزمرہ معمول کا حصہ نہیں ہے۔ جبکہ میری شدید خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب شریک طعام ہوں۔

بعد از پروگرام ڈاکٹر صاحب نے ہم سے اجازت چاہی اور رخصت ہوئے اور ان کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ ایسی عظیم الشان شخصیت کے ساتھ ایسی محافل کا انعقاد کیا جانا چاہیے جہاں صرف ان ہی کو سنا جائے، ان کی زندگی کے تجربات سے کچھ سیکھا جائے اور اچھا وقت بتایا جائے۔ میری خواہش ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے علم۔ اور فن پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبا و طالبات کام کریں۔ تاکہ نئی نسل کو اس کثیر الجہات شخص کے کام سے استفادہ کرنے کا موقع ملے۔

ڈاکٹر صاحب کے چند اشعار دیکھیے:

گھر والے کہہ رہے ہیں بہت بولتا ہوں میں
دیواریں کہہ رہی ہیں کوئی بات کیجیے

ہماری سادگی ہم کو ہی لے کے ڈوب گئی
وہ ڈیٹ کہتی رہی، ہم کھجور لاتے رہے

لاکھ کوشش کی مگر پھر بھی وہ بوڑھا لڑکا
تم نے چھوڑا تھا جہاں اب بھی وہیں رہتا ہے

خودکشی میرے غم میں تم کر لو
کوئی ارمان تو میرا نکلے

ہم چلے جائیں گے، پھر کون بتائے گا تمہیں
ملک تقسیم ہوا جب، تو ہوا کیا کیا تھا

ہم مسائل رسیدہ لوگوں کا
ایک ہی مسئلہ تو ہوتا ہے
مسئلہ ہم بتا نہیں سکتے

تحریر کے آخر میں، میں ڈاکٹر صاحب کے لیے دعا گو ہوں کہ آپ جہاں بھی رہیں صحت، تندرستی، کامیابیاں اور ڈھیروں خوشیاں آپ کی منتظر ہوں --- آمین --- وما علینا الا البلاغ۔

☆☆☆☆☆

ممتاز ادیبوں کے ذاتی خطوط

کلیم خارجی

محترم ڈاکٹر فاضل میواتی صاحب

آپ کا پہلا اور شاید آخری شعری مجموعہ ''آہ زلیخا'' مجھے پندرہ دن پہلے مل چکا تھا۔ آخری شعری مجموعہ کی ترکیب یقیناً میری وضاحت کے بعد آپ کو ناگواری کا احساس نہیں دے گی۔ میری اور آپ کی غیر متوقع اور ناگہانی دوستی یا چہرہ شناسی کو تقریباً پندرہ سال ہونے کو آئے ہیں۔ میں نے آپ کو فطری طور پر انشائیے اور افسانچے کا ادیب کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اور آپ ایک عرصہ تک خود بھی اسی رُتبے اور اہلیت کے دعویدار رہے ہیں۔ اس لیے میری پہلی رائے یہ ہے کہ آپ کی اگلی کتاب انشائیوں اور افسانچوں پر مشتمل ہوگی اور شاید اس کا نام اعترافِ زلیخا ہو۔ کیونکہ آپ چند برس پہلے مصر کے دورے سے آنے کے بعد زلیخا کے حوالے سے نئی بصیرتوں سے مالا مال ہوئے ہیں۔ میری دوسری رائے یہ ہے کہ ملک میں پھیلی ہوئی مذہبی انتہا پسند تحریکوں کے پیش نظر آپ یقیناً آہ زلیخا، کو اپنی آخری کتاب کا ہی درجہ دیں گے - یا پھر جہاں جہاں آپ نے کتاب رکھوائی ہے، وہاں سے آپ اُٹھوا لینے میں بھی اتنا ہی پیسہ خرچ کریں گے۔

جتنا آپ نے کتاب کی اشاعت میں صرف کیا تھا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ میری مذکورہ بالا دونوں آرا جہالت، ذہنی پراگندگی اور نامردم شناسی کا نتیجہ ہوں کیونکہ آپ ایک سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ جتنی سہولت آپ کو شاعر ہونے میں میسر آئی ہے اس سے کئی گنا آپ کو ایک دین دار، نیک اور پابند صوم صلوٰۃ ثابت کرنے میں بھی کام آسکتی ہے۔

ملک کے مختلف اخبارات میں آپ کی کتاب کی تقریب رونمائی کی تصاویر اور خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں بہت سے ممتاز ادیبوں اور نقادوں نے آپ کو اس عہد کے بڑے شاعروں میں کھڑا کر کے تقریب کے بھرم کو قائم رکھا ہے۔ خدا جانے یہ بُرا ہے کہ بھلا ڈاکٹر محمد علامہ اقبال صاحب حقیقی طور پر موجود تھے۔ اور ان کے فنی اور فکری کمالات آج بھی ہمیں ذہنی طور پر سیراب کرتے ہیں۔ اگر خلقت پاک و ہند آج کسی حادثے کے نتیجے میں آج علامہ اقبال کے بارے میں جاہل اور انجان ہو جائے تو آپ کے مداحوں اور نقادوں کا کام بڑی حد تک آپ کو بلاشبہ ایک عبقری شاعر، فلسفی اور دانشور کے مقام پر منوا سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اقبال جس مقام پہ کھڑے ہیں انہیں کھسکا کر آگے پیچھے کرنا۔ کارزیاں کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ آپ نے ذاتی طور پر مجھے ایک دوست کا رتبہ دے کر کتاب بھجوائی ہے۔ اسلئے آپ ضرور اس امر کے بھی خواہاں ہوں گے کہ میں اُس پہ اپنا تنقیدی اور توصیفی مضمون لکھوں۔ میں آپ کی خواہش کو محسوس کر کے اپنا مختصر سا مضمون تو لکھ چکا ہوں لیکن کسی ادبی جریدے میں شائع کرنے سے پہلے اس کو آپ کے ملاحظے میں لانا چاہتا ہوں۔ تاکہ آپ کی اس آشیرباد کے بعد میں اسے چھپوا کر اُردو ادب کے قارئین اور نقادوں کی نظر میں سرخرو ٹھہروں۔

آپ کا مخلص ممتاز عالم چوڑکانوی ۱۵ مئی ۲۰۱۵

.....

تبصرہ:

نام کتاب: آہ زلیخا

مصنف: ڈاکٹر فاضل میواتی

تبصرہ عالم نگار: ممتاز عالم چوڑکانوی

ڈاکٹر فاضل میواتی صاحب ملک کے ادبی حلقوں میں ایک بڑا نام ہے۔ ان کا کلام قطعات، نظمیں اور غزلیں تواتر کے ساتھ ملک کے معتبر ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگرچہ سائنس اور انجینئرنگ کے شعبہ میں ایک بہت لائق فائق اور تجربہ کار آدمی ہیں اور ملک کے ایک سرکاری سائنسی دارے میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ انکی پیشہ ورانہ خدمات کی نہ صرف ملک بھر میں بلکہ بیرونی ممالک

میں بھی دھوم مچی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف سیمیناروں میں شرکت کے لیے انٹرنیشنل درسگاہوں اور اداروں میں مدعو کیے جاتے ہیں۔ ملک میں موجود ہر شعبے میں ان کے مداح اور دوست و احباب موجود ہیں۔ عوام و خاص میں انہیں ایک مفکر، دانشور، اور غیر معمولی شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ان کا شعری مجموعہ آہ زلیخا آج کل Hotcake کی طرح ادبی اور ثقافتی حلقوں اور شعبوں میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی میگزین یا اخبار میں ان کی شخصیت اور کتاب کے حوالے سے مضامین اور تبصرے شائع ہو رہے ہیں۔ آہ زلیخا میں سب سے غیر معمولی اچ اس کے سرورق میں نمایاں ہے۔ مصور نے کسی نسوانی چہرے یا ہیولے کو ابھارنے کے بجائے آہ زلیخا کو جس طرح نیلے سبز اور سرخ رنگوں میں حرف حرف لیکر کے ترتیب دیا ہے کہ غور کرنے سے پہلے حروف کی بناوٹ اور رنگوں کی آمیزش دیکھنے والے کو کافی دیر تک اُلجھائے رکھتی ہے۔ سرورق واقعی بے حد پُرکشش اور کتاب کے مجموعی مواد سے کئی گنا زیادہ اعلیٰ اور معنی خیز ہے۔ کتاب کھولنے کے بعد انتساب والے صفحے پر کتاب کا نام۔ جلی حروف میں لکھا ہوا ملتا ہے تو قاری کو کتاب کا نام پتہ چلتا ہے جسے پڑھتے وقت اس کے منہ سے ہلکی سی ایک آہ ضرور نکلتی ہے۔ اور قاری کی ہی آہ، جو آہ زلیخا پڑھتے وقت اُبھرتی ہے۔ اس کتاب کی بڑی خوبی کے طور پر ادبی حلقوں میں سراہی جاتی رہے گی۔ کتاب کی دوسری بڑی خوبی سات صاحبان علم و دانش کی مختصر اور طویل تبصرے ہیں۔ جنھیں ان کی شہرت اور رُتبے کے اعتبار سے شعری مجموعے کے مختلف جگہوں پہ سجایا گیا ہے۔ انتساب کے بعد صاحب کتاب کا اپنا لکھا ہوا ایک جامع مضمون ہے۔ جس میں اُنھوں نے اپنے شاعر ہونے کے واقعات اور حادثات کو منطقی انداز سے بیان کرتے ہوئے ان سات عظیم لوگوں کی سچائی، اخلاص اور فنی عظمتوں کا ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے اسی مجموعے کے بارے میں تنقیدی اور توصیفی مضامین لکھے ہوئے ہیں۔ کتاب کی تیسری بڑی خوبی یہ ہے کہ ہمارے ممدوح شاعر نے اس کا انتساب اپنی مرحومہ بیگم زیتون میواتی کے نام لکھا ہے جبکہ ان کی ایک بیگم بفضل خدا بقید حیات ہیں۔ جو ایک طویل اور سخت معاشقانہ جدوجہد کے بعد ان کی نکاح سے فیض یاب ہوئی ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے فاضل میواتی اپنی دوسری بیگم کی زندگی میں اپنی آئندہ کتاب ان کے نام انتساب کروا کے چھپوائیں گے۔ یوں میواتی صاحب ادب و شعر کے ساتھ ساتھ اپنی بیگمات کے حوالے سے بھی اُردو ادب کی

تاریخ میں یاد رکھے جائیں گے۔

آہ زلیخا فاضل میواتی کی عظمت اور ادبی حوالے سے ان کے اعلیٰ مرتبے کی دلیل بنتی ہے۔ ان کی مستند تخلیق سے کیونکہ جن سات فضلا اور حکما نے کتاب جو جو مضامین لکھ رکھے ہیں۔ ان کو پڑھ لینے کے بعد قاری حیرانی و پریشانی سے کتاب میں وہی شاعری ڈھونڈنے لگتا ہے۔ سنجیدگی اور فکری شعور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو کتاب میں حیرت انگیز مواد بھی وہی ہے جو تعارفی، توصیفی اور تنقیدی مضامین کی صورت میں سطر سطر جگمگاتا دکھائی دیتا ہے۔ پانچ مضمون نگار تو اس مؤقف کی تائید میں متفق نظر آتے ہیں کہ فاضل میواتی ایک ذہین پختہ کار اور نامور سائنسدان ہیں اور اپنے پیشہ ورانہ فرائض اور سرگرمیوں سے وقت نکال کر اُنھوں نے جو شاعرانہ معرکہ سرانجام دیا ہے۔ وہ اُنھیں عظیم سائنسدان کے ساتھ ایک معتبر اور جدید شاعر منوانے کے لیے کافی ہے۔ اُنھوں نے یہ نوید بھی قاری کے فائدے کے لیے لکھ رکھی ہے کہ اگر فاضل میواتی جز وقتی شاعری کے بجائے کل وقتی شاعر بن گئے۔ تو ان کی شاعرانہ قد و قامت کا اندازہ لگانے کے لیے بہت سے نقادوں اور دانشوروں کو اپنی توند بہت باہر نکال کر ان کی قد و قامت کا اندازہ لگانا پڑے گا۔ ان میں ایک نامی گرامی شاعر یاسین علی مرزا عبدالرؤف بیگ ہیں جبکہ دوسرے پروفیسر ڈاکٹر بہرام باغپوری صاحب ہیں۔ دونوں فاضل میواتی صاحب کے قدیم اور گہرے دوست ہیں۔ دونوں کے مضامین بڑی حد تک فاضل میواتی صاحب کی ذاتی شخصیت کا احاطہ کرتے ہیں۔ مرزا عبدالرؤف بیگ صاحب تو اخبارات، ریڈیو اور آج کل فیس بک پر ایک سٹار بن کر چھائے ہوئے ہیں۔ سیاسی، علمی اور روحانی شخصیات کے پہلو میں کھڑے ہوئے ان کی تصاویر ہر روز سماجی ذرائع ابلاغ کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ اُنھوں نے فاضل صاحب کے بارے میں لکھا ہے۔ ”جب سائنسدان فاضل میواتی نے مجھے اپنی لکھی ہوئی پہلی غزل سنائی تھی۔ تو میں کئی دن تک اس غزل کے جادو کے اثر میں رہا اور یہ فیصلہ کرنے میں آج تک تذبذب کا شکار ہوں کہ فاضل میواتی ایک سرکاری افسر یا ایک سائنسدان ہے یا ایک اچھا شاعر ہے۔“

بہرام باغپوری صاحب نے فاضل میواتی صاحب کے قدیم دوستی پر اپنے فخر اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اس بات کا سچائی کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ دُنیا، سائنس اور زندگی کے بارے میں ان کے پاس جو علمی اور مادی سرمایہ ہے۔ وہ سب فاضل میواتی صاحب کی دوستی کی بدولت ہے اُنھوں نے اپنے مضمون، سائنسدان

جو کہ شاعر نکلا، میں بڑی مہارت سے فاضل صاحب کو ایک بڑا فنکار اور بڑے شاعر کہتے ہوئے یہ تاریخی جملہ لکھا ہے کہ بلاشبہ شاعر فاضل میواتی ایک بہت بڑے سائنسدان اور بہت اعلیٰ افسر کے پیچھے چھپا ہوا سمٹا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد یہ شاعر جست لگا کر ستاروں پر کمند ضرور ڈالے گا۔ محترم دانشوروں کے مضامین نے آہ زلیخا میں موجود تیرہ قطعات، تیرہ نظموں اور سات غزلوں کی گہرائی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شعری مجموعے کی ضخامت اور رُعب میں کئی گنا اضافہ بھی کیا ہے۔ تمام مضامین اتنی جامعیت اور ادبی دانشمندی سے لکھے گئے ہیں کہ آہ زلیخا میں موجود شاعری پہ سچ مچ آہ سی نکل جاتی ہے۔ میری کم علمی اور ناتجربہ کاری مجھے بار بار یہی احساس دلاتی ہے کہ تنقیدی مضامین بہت پہلے لکھے گئے ہیں اور پھر اُن کی روشنی میں فاضل میواتی نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا شعری مجموعہ مرتب کیا ہے۔ ادب کے حقیر و بے مایہ طالب علم کی حیثیت سے میری رائے یہ ہے کہ نثری ادب کے سنجیدہ قاری کو آہ زلیخا میں لکھے ہوئے توصیفی اور تنقیدی مضامین میں نہایت عمدہ توصیفی نثر کو پڑھنے کا موقع ملے گا۔ کتاب کے لیے بہت اعلیٰ سفید اور سبز کاغذ استعمال کیا ہے۔ جلد بھی اچھی خاصی بھاری اور موٹی ہے جس پر سرورق بہت خوبصورتی سے آنکھوں کو اپنی طرف مائل کرتا ہے میز پہ بند پڑی ہوئی یہ کتاب بڑی دلکش اور معنی خیز دکھاتی ہے۔ کتاب کی قیمت عام طالب علم یا قاری کی پہنچ سے دُور ہے۔ جس پہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ فاضل میواتی صاحب نے یہ کتاب اپنے عزیزوں اور پسندیدہ لوگوں کو تحفے میں دینے یا دُکانوں اور گھروں کے شیلف سجانے یا سرکاری لائبریریوں کے لیے شائع کی ہے۔ کتاب کی پشت پر شاعر کی نیم تجریدی تصویر اُنہیں یونان کے عظیم فلسفیوں سے تشبیہ دیتی ہے۔ جو سچائی اور فلسفے کی پاداش میں اپنے ملک کے حکمرانوں کے عتاب کا شکار ہوئے ہوں۔ مجھے بہرام باغپوری سے اتفاق کرتے ہوئے فاضل میواتی صاحب کے ریٹائرڈ ہونے کا انتظار ہے۔ دُعا ہے کہ وہ عزت اور سہولت سے سبکدوشی کے مرحلے طے کر پائیں۔ آہ زلیخا کا شاعر سچ مچ ایک بہت بڑے سائنسدان اور ایک سرکاری آفیسر کے بوجھ تلے سبک کر رہ گیا ہے۔ اسکے دل اور قلم سے صرف ایک ہلکی سی چیخ اس شعری مجموعے کی اشاعت کا باعث بن گئی۔

ارے ممتاز چوڑ کا نومی میاں
جیسے ہو ویسے ہی رہو۔
تمہاری ماں کی ------؟ عظمت کو سلام

جس نے تم جیسے آدمی کو جنم دیا اور اُسے پال پوس کر آج اس مقام پہ پہنچایا کہ نہ اِلا الذی نہ اُلا الذی

بھئی تمہارا بمعہ تمہارے تبصرے کے دو ہفتے قبل موصول ہوا تھا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہوئی۔ میں نے تمہیں خط کا جواب لکھتے ہوئے کئی دفعہ خط پھاڑ کے دوبارہ لکھے مجھے تمہاری شان کے مطابق الفاظ چن کر لکھنے میں کافی وقت ہوئی۔

اصل میں مجھے سمجھ نہیں آئی تھی کہ تم نے مجھے اپنے ذاتی خط میں تبصرہ لکھ بھیجا ہے یا تبصرے والے خط میں میرے متعلق تمہاری ذاتی رائے لکھ دی گئی ہے۔ بہرحال مجھے تمہارے اندر کے سڑیل، حاسد آدمی کی غلیظ بُو محسوس ہوئی۔ ارے بھائی تم اگر میری تعریف میں کچھ لکھتے تو کیا لکھ پاتے تم سے زیادہ لائق اور معتبر لکھنے والوں نے کوئی کسر ہی نہیں چھوڑی مرزا عبدالرؤف بیگ، پروفیسر باغپوری، امداد پرایا اور اسامہ تونگر کا لکھا ہوا پڑھ کر تم ذہنی اور اخلاقی افلاس کا شکار ہو کر رہ گئے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے۔ کہ برسوں پرانی پوشیدہ باتیں میں آج تم پر ظاہر کر دوں۔ تو میں میرے تمام احباب جنہیں تم اچھے طرح سے جانتے ہو کبھی دل سے تمہیں پسند نہیں کیا اور نہ ہی میں نے تمہیں کبھی اپنے حلقے میں گھس بیٹھنے کا کوئی موقع دیا ہے۔ پروفیسر بہرام باغپوری تمہارے معاملے میں ہم سب کے مرشد سمجھے جاتے ہیں۔ وہ مجھ سمیت اپنے کسی دوست کو تمہارے ساتھ مخلص ہونے کا مشورہ نہیں دیتے کیونکہ وہ ہم سب سے زیادہ تمہارے قریب رہے ہیں۔ اس لیے وہ تمہیں محروم اور بدقسمت رکھنے میں خاص قسم کی مسرت اور فتح محسوس کرتے ہیں۔ امداد پرایا صاحب کی رائے یہ ہے کہ تمہارا ذاتی کردار، خاندانی پس منظر اور ملحدانہ عقائد ایسے ہیں۔ کہ معزز اور اعلیٰ خاندان کے ادیبوں اور شاعروں کو تم سے دور رہنا چاہیے۔ اُسامہ تونگر صاحب تو خود بھی ایک ادبی اور ثقافتی تنظیم کے بانی اور سربراہ ہیں اُنھوں نے آج تک تم سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ اُنھوں نے تمہیں کبھی کسی تقریب میں دعوت دینا گوارہ نہیں کیا۔ مرزا عبدالرؤف بیگ نے اپنے تمام دوستوں پر یہ پابندی عائد کر رکھی ہے۔ کہ کوئی تم سے بھلائی نہ کر پائے۔ مجھے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اُنکے اندر تمہارے لیے بے حد نفرت دبکی رہتی ہیں۔ اُنھوں نے تمام پروفیسر، ڈاکٹروں، اخباری مدیروں اور سرکاری شاعروں اور ادیبوں کو تنبیہ کر رکھی ہے۔ کہ کوئی تمہیں کبھی کسی قسم کا گھاس کھانے کا موقع نہ دیں۔

میاں چوڑ کانوی صاحب جب شہر کی طوائفوں، خواجہ سراؤں، مراثیوں، بانڈوں

اور چرسیوں کے پسندیدہ رہو گے تو میرے احباب میں سے کون تمھارے ساتھ تعلق قائم رکھنے کا خطرہ مول لے سکتا ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ تمھارے ملحدانہ خیالات اور جذبات کا چرچہ بھی زبان ضد عام ہے جس کا خمیازہ صرف تم کو اکیلے ہی بھگتنا چاہیے۔ رہی بات میرے ریٹائر ہونے کی جو کہ تمھارے دل کی ایک حاسدانہ خواہش ہے۔ لیکن یاد رکھو اگلی دہائی تک اس ملک کے اعلیٰ سول اور سرکاری اداروں کو کسی نہ کسی طرح میری ضرورت رہے گی - جبکہ تم اپنی 72ویں سالگرہ کا رونا رو چکے ہو - اپنے سرکاری عہدے کی وجہ سے میں اپنے بہت سے شاعر اور ادیب دوستوں کے کام آچکا ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست میری صحت لمبی عمر اور سرکاری ترقیوں کے لیے میرے حق میں دُعائیں مانگتے رہتے ہیں - تمھیں شاید خوشی نہ ہو کہ میں نے اُسامہ تونگر کے چھوٹے بھائی کو اٹلی کے سفارتخانے میں مستقل طور پر بہت اچھی تنخواہ کے عوض خانسامے کے کام پر لگا دیا۔ امداد پرایا صاحب کی بیٹی کو ایم فل کرنے سے پہلے ہی تعلیمی اسکالرشپ پر سویڈن بھیج دیا - مرزا عبدالرؤف صاحب میری کوششوں سے اگلے چند دن میں خاندان سمیت کینیڈا منتقل ہونے والے ہیں۔ مزید یہ کہ میں نے بہرام باغپوری کے دونوں بیٹوں کو فرانس اور سری لنکا میں بارٹینڈر کی نوکری پر لگا کر باغپوری صاحب کو بہت سے فکروں سے نجات دلا دی۔ چند دن بعد سرکاری سطح پر ملک کی ممتاز جامعات میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے جن کے لیے میزبانوں اور شاعروں کا انتخاب کر لیا گیا ہے۔ تمھاری حیثیت کے سینکڑوں شاعروں نے اپنی شمولیت کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا ہے۔ لیکن تم دیکھ لینا کیسے کیسے لوگ منہ تکتے رہ جائیں گے - اسی سال ستمبر میں ادبی اور ثقافتی طائفوں کا سلسلہ بیرون ملک بھیجنے کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ جس کے لیے تم کسی معیار پر پورا نہیں اُترتے تم اپنے خاص مزاج، سوچ اور معاشرتی رویوں میں اکیلے نہیں ہو۔ تمھاری طرح کے ہزاروں ہے جنھیں محروم اور بے نوا رکھنے میں کبھی کسی کو پچھتاوا نہیں ہوتا۔ تم جیسے لوگ خود بھی اپنے فائدے اور مرتبے کے معاملے میں کاہل اور جاہل ہی رہتے ہیں۔ تم اپنی ادھ جلی انا اور نامعقول تخلیقی ادب کے بل بوتے پر ہمیشہ گمنام مفلس اور دھتکارے ہوئے رہوں گے۔

چلو تم اپنا لکھا ہوا تبصرہ ہی کہیں چھپوا کر دکھاؤ تو مانوں۔

از طرف: ڈاکٹر فاضل میواتی ۶ جون ۲۰۲۲

☆☆☆☆☆

احمد بشیر مکاتیب کے آئینے میں

مراسلہ نگاری کا شعبہ کسی شخصیت کے فکروفن کی جانچ اور مطالعے کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ خط لکھ کر انسان کو یقین نہیں ہوتا کہ اس کے گاہے گاہے دوستوں، رشتہ داروں یا اولاد کو لکھے ہوئے خطوط کبھی یکجا شائع بھی ہونگے؟ چنانچہ خطوط میں انسان کی شخصیت کے مختلف پہلو آرائش وزیبائش کے بغیر جھلکتے ہیں۔ ہر چند کہ غالب کے خطوط سے شائبہ ہوتا ہے کہ جب وہ خط لکھتے تھے تو انھیں علم تھا کہ ان کے خطوط ادب پاروں میں شمار ہوں گے۔ لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔ چنانچہ یہی باعث ہے کہ غالب کے خطوط شاعری کی نسبت ان کی سائیکی، ماحول اور عہد کے بہتر عکاس ہیں۔ شوخی وشوخ چشمی، صاف سادہ زبان اور ڈرامائیت (مراسلے میں مکالمے کا اسلوب) سے بھرپور منفرد اندازِ بیان، ان سب نے مل کر ان کے خطوط کو شاہکار نثر بنادیا۔

احمد بشیر نے بطور صحافی اپنے قلمی سفر کا آغاز روزنامہ امروز سے کیا۔ وہ ایک نڈر اور بے باک صحافی تھے مگر ان کے اندر کا فنکار ہمہ وقت مضطرب رہا۔ ان کی تحریر؛ کالم، مضامین، خاکے اور ناول، سب میں ان کے آدرشوں اور طرز فکر کے ساتھ ایک نامیاتی تعلق پایا جاتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے خطوط کا ایک مجموعہ ''خطوں میں خوشبو'' نیلم احمد بشیر نے تالیف کیا ہے۔ خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے مگر احمد بشیر کے خطوط ایک مونتاج کی طرح ان کی پوری شخصیت کی تصویر بناتے ہیں۔ احمد بشیر کے احوال وآثار کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے خطوط تک پہنچ کر ان کی تصویر کے تمام اجزا مکمل ہوجاتے ہیں۔

ہر چند مکاتیب غالب کے بعد اردو میں مراسلہ نگاری ایک صنف کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ احمد بشیر، غالب کی طرح شاعر نہیں تھے۔ جس طرح غالب اپنے خطوط میں بدیع و بیان کو اپنے اسلوب میں لئے اظہار ذات کے لیے استعمال کیا۔ احمد بشیر کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں تھا۔ احمد بشیر کی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور واقعاتی اُتھل پتھل کے برعکس ان کے لکھے خطوں کے آئینے میں ان کی اپنی تصویر بولتی ہے۔ ان کے خطوط اور دیگر تحریریں مل کر مونتاج کی صورت ان کی شخصیت کی تصویر بناتی

محمد ظہیر بدر

ہیں۔ نیلم احمد بشیر نے مکتوب الیہان کے اعتبار سے ان خطوط کو تین انواع میں تقسیم کیا ہے: اول اہلِ خانہ کو لکھے گئے خطوط جو ان کی اہلیہ محمودہ بیگم، ان کے بچوں (نیلم، پپو، گوپی، مانو، ہو پپو، گوپی، مانو، ہومی) اور دامادوں (سراج، شاہد، اقبال اور عباس) کے نام ہیں۔ فصل دوم: دوستوں (ممتاز مفتی، ارشاد احمد حقانی، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، افتخار عارف) کے نام۔ سوم: (منہ بولے بیٹے) مجید احمد کے نام

احمد بشیر درون خانہ:

اس فصل میں ہم احمد بشیر کے خطوط کے حوالے سے ان کی درون خانہ شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ احمد بشیر کی زندگی میں ان کی شریک حیات محترمہ محمودہ بیگم کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ جس کا ذکر ان کی تحریروں اور ان کے خطوط کے علاوہ ان کے قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کی گفتگو میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ خود ان کی اہلیہ کی لکھی ہوئی خودنوشت میں محمودہ بیگم کی وفا شعاری کے ساتھ ساتھ ان کے آپس کے پیار محبت کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ جلد سے جلد اپنا کام مکمل کر کے وطن اپنے اہلِ خانہ اور دوست احباب کے پاس واپس پہنچ جائیں۔ لکھے گئے خطوط میں انھوں نے متعدد بار اپنی اہلیہ سے دوری اور یاد آوری کا ذکر جس اداسی و بے قراری سے کرتے ہیں لگتا ہے کہ وہ شادی کے فوراً بعد نئی نویلی دُلھن کو چھوڑ کر امریکہ آ گئے ہوں۔ انھیں ہر جگہ اپنی بیوی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اس کا ذکر ان کے ہر دوسرے خط میں ملتا ہے۔ امریکہ پہنچتے ہی پہلے خط میں لکھتے ہیں:

''شام کو میں اداس ہوتا ہوں اور اس وقت تمھیں بہت یاد کرتا ہوں۔'' اگلے خط میں لکھتے ہیں ''.....دراصل میں تمھارے بغیر رہنے کے قابل ہی نہیں''

ایک اور خط میں کہتے ہیں:

''میں تو تمھارے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ میں جو رہ رہا ہوں تمھارے لیے اتنا مشکل نہیں ہوگا۔ پھر تمھارے پاس تو میری پیاری گڑیاں بھی ہیں اور میرے پاس تو ان کی تصویر بھی نہیں.....تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ اور آگے چل کر زیادہ یاد آؤ گی کیونکہ تمھارے بغیر رہنے کی مجھے عادت نہیں۔ یہ جدائی بہت لمبی ہے لیکن جیسے تیسے گزرے گی۔.....''

ایک خط میں اپنی نصف بہتر کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں یوں کرتے ہیں:

تمھاری ایک تصویر تو مجھے مل گئی۔ آج ہی ملی، اس لیے میں بہت خوش ہوں اور کوئی بیس مرتبہ دیکھ چکا ہوں اور دو سو آدمیوں کو دکھا چکا ہوں۔ کہ یہ ہے وہ عظیم لڑکی جو میرے ساتھ شق کرتی ہے جس کی بیوقوفی پر میں مرتا ہوں یعنی اتنا بے وقوف ہوں اور اتنی اچھی ہے وہ۔

انھوں نے امریکا سے مودی بیگم کو جتنے بھی خط لکھے ان میں پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے اہلِ خانہ سے دوری کی وجہ سے بہت اداس ہیں۔ ایک خط میں اپنی مودی کو وہاں کے احوال بڑی دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔ کہتے:

''یہاں صرف ایک لڑکی میری دوست ہے۔ بے چاری بہت موٹی اور لمبی ہے اس سے کوئی بات نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ چلو تم میری بہن ہو۔ بے چاری بڑی اچھی اور نیک لڑکی ہے اور چونکہ بہت موٹی اور لمبی ہے دیو کا دیو۔ اس لیے اسے آدمی بہن کے سوائے کیا کہہ سکتا ہے۔ ویسے میری پیاری ان شاء اللہ سالم واپس آؤں گا۔ میرے ذہن میں کبھی بدکاری کا خیال بھی نہیں آیا۔ کمال ہے۔''

یہ حقیقت بھی احمد بشیر کے خطوط سے ہویدا ہے کہ انھوں نے اپنے ہر رشتے کو خوب نبھایا اس کے تقدس اور محبت کے جملہ تقاضے پورے کیے۔ بیوی کے علاوہ جو خطوط انھوں نے اپنے بیٹے بیٹیوں اور دامادوں کو لکھے ان میں احمد بشیر ایک مہربان باپ کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ وہ خطوں میں بھی اپنی بیٹیوں بیٹوں سے گفتگو کرتے ہیں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو عام طور پر آمنے سامنے بات چیت میں کیے جاتے ہیں۔ بچوں کو لاڈ لڈانے کے لیے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً: ایک خط میں بیٹیوں کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔ ''..... نیلا جانا، پوپا گوپا، (نیلم، سنبل بشریٰ،) بشریٰ کو اکثر، گوپو پیاری، قلزم کو پیاری مانو اور بیٹے ہمایوں کو، پیارے ہومی، کہہ کر مخاطب کرتے اور خط کی عبارت میں بھی ایک باپ کا پیار بھرا لہجہ جھلکتا ہے۔ انداز ملاحظہ کریں:

''میری پیاری چڑیو! تم کیا جانو تم مجھے کتنی پیاری ہو۔ سارا خزانہ میرا تم ہی تو ہو۔ پوپے (سنبل) سو رہے تم سکول جاتے ہی کہ نہیں ابھی تو وڑ نگے مارتے ہو۔ خدا کے واسطے سکول جاؤ اور بیٹا گم نہ ہو جانا۔ تم بڑی بھولی ہو۔ مجھے ہر وقت تمہارا فکر رہتا ہے اور گوپا (بشریٰ) آج کل کیا بکواس کرتا ہے پوری کہانی لکھو۔ اب جواب جلد دو ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔'' (ص:۸۱)

ایک خط میں بشریٰ کو پیار سے ان الفاظ میں ڈانٹتے ہیں۔

''گوپو پیاری! مجھے مانے (مانو، قلزم المعروف اسما عباس) کا نہیں، تمہارا فکر ہے کیونکہ مانے کو تو تم سنبھال ہی لوگی اور وہ ہمت والی بھی ہے۔ مگر تمہارا سنبھالنے والا کون ہے۔ تم بالکل الو کی پٹھی ہو۔ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتیں، کھانا نہیں کھاتیں اور معمولی معمولی باتوں پر جو آ کر روز گزر جاتی ہیں، غم کھاتی ہو کبھی نہیں کہتیں، سوؤٹ (so what) ..... جب تم غم میں محصور

ہو جاؤ تو کہو سوٹ! پھر اپنے سے بحث کرو کہ آخر ایسی کون سی قیامت آ رہی ہے۔ (ص:۸۲)

دامادوں کو خط لکھتے ہوئے وہ ایک صلح، مصلحت پسند اور محبت کرنے والے سسر اور فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کرنے والے مرد کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ان کے خاندانی خطوط سے درون خانہ ان کی پریشانیوں اور مسائل اور ان کے حل کے لیے احمد بشیر کی معاملہ فہمی پر نظر پڑتی ہے۔ سراج (نیلم کے شوہر) کے نام ایک خط میں کہتے ہیں:

پیارے بیٹے سراج!..... نیلم نے آپ کے پس منظر کے بارے میں جو کچھ لکھا، اس کے بارے میں کسی قدر پریشانی ہوئی۔ اگرچہ وہ آپ سے ہر طرح خوش اور مطمئن ہے۔ آپ کو چاہئے تھا کہ مجھے سب کچھ بتا دیتے۔ خصوصاً اس لیے کہ میں بہت صاف گو آدمی ہوں اور صاف گوئی کو پسند کرتا ہوں میرے لیے سب سے اہم بات صفائی اور سچائی ہے..... جتنا نیلم نظر آتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ گہری اور عظیم لڑکی ہے۔ اس کو سچ بولنا اور سچائی کی پر ڈٹ جانا سکھایا گیا ہے مگر اس میں قربانی کا جذبہ بھی بے پناہ ہے۔..... نیلم میں کوئی خرابی نہیں، اگر ہوتی تو آپ کو معلوم ہو گئی ہوتی ..... اگر آپ کو اس سے کوئی شکایت ہو تو بلا تکلف مجھے لکھئے..... کیا آپ کو اس کا احساس ہے کہ نیلم میں اس کے سوا کوئی نقص نہیں کہ وہ برتن توڑتی ہے مگر وہ دل نہیں توڑتی۔" (ص:۸۴)

اپنے چھوٹے داماد کرنل عباس گل کو خط میں لکھتے ہیں:

"عقل کی بات یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ ملا ہے اس پر اللہ کا شکر ہر گھڑی ادا کرے۔ بندگی کا یہی تقاضا ہے ---- مانو کا ایک خط مجھے ملا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ تم شدید جذباتی الجھن میں ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم پر ایک سے انصاف کرنا چاہتے ہو مگر بعض اوقات جن لوگوں کو تم اپنا خون پلا کر بھی انصاف دیتے ہو، ان کی رائے میں وہ کم ہوتا ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں اور ان پر کڑھنا اپنی طاقت کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے۔ تمہارے مسائل بہت لمبے چوڑے ہیں۔ مثلاً بھائیوں کا غم، ماموں سے جھگڑے، بہنوں کے مستقبل، پھر اپنے گھر میں عذرا (پہلی بیوی) کو مطمئن رکھنا، مانو کو خوش رکھنا--- مگر ایک حدیث ہے کہ خدا کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ اٹھانے پر مجبور نہیں کرتا۔ دیکھو کتنی پیاری بات ہے اس کا مطلب ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تم پر بوجھ ڈالا ہے تو اس کو اٹھانے کی طاقت بھی دی ہے۔ کیا یہ شکر کا مقام نہیں۔" (ص:۱۰۴،۱۰۵)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''عباس کا کلیجہ، شیر کا کلیجہ ہے۔ دل مومن اور ایمان پختہ۔ وہ زیرک ہے۔ ان شاء اللہ اپنا گھر خوشگوار بنالے گا۔ مگر عذرا اور مانو دونوں اس سے تعاون کریں۔ سارے بوجھ تو اسی پر ہیں۔ تم لوگ اس کی کمزوری نہ بنو، طاقت بنو۔ ابھی تک جو حالات میں نے سنے ہیں، وہ اچھے ہیں۔ تم دونوں کو بھی ایثار کرنا پڑتا ہے --- جو ملا ہے اس پر شکر خدا بجالایا کرو۔ جو نہیں ملا، اس پر صبر کرو، سب کچھ کسی کو بھی نہیں ملتا۔ یہی اللہ کی حکمت ہے۔'' (۱۰۰)

اپنی بیٹی اسما کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

اب میں کس کس کی تعریف کروں۔ سبھی تعریف کے لائق ہیں مگر سب سے زیادہ قابل تعریف عذرا (کرنل عباس کی پہلی بیوی) بیٹی ہے۔ جو نے خوش دلی سے صورت حالات کو قبول کیا۔ مانو بھی بہت قابل تعریف ہے۔ ہم اسے ہمیشہ نادان، معصوم اور کمزور بچی سمجھتے رہے----- -- مگر میری اولاد میں سے وہی سب سے زیادہ دانش مند نکلی۔ اگر یہ دو خواتین آپس میں سب کچھ شیر نہ کرتیں تو عباس بیٹے تم زندہ جل جاتے۔'' (ص:۱۰۱)

ان خطوں میں وہ احمد بشیر جو اخباری کالموں اور مضامین میں قلم لیے دندناتا پھرتا نظر آتا ہے۔ اس کے بجائے یہاں ایک معاملہ فہم سسر اور مہربان اور ہمت بندھاتا مشیر بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کی بیٹی مانو (اسما عباس) اور عباس کی یہ دوسری شادی تھی۔ چنانچہ اس ازدواجی درجے پر ایک باپ کو اپنی بیٹی کو کیا نصیحت کرنی چاہیے۔ انھوں نے اپنی ازدواجی زندگی ایک مثالی گھرانے کی طرح گزاری۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ان کا گھر خوشیوں کا گہوارہ بنا رہا اور وہ پورے قد سے اپنے اصولوں کے ساتھ کھڑے رہے تو اس میں ان کی اہلیہ کے ایثار، محبت، ثابت قدمی اور سپردگی کا اہم ترین کردار تھا۔ اسی لیے انھوں نے اپنی بیٹیوں کو بھی اپنی بیوی کی طرح ایثار اور محبت کا درس دے کر انھیں بتایا کہ جیسے ان کی ماں نے اپنے خاوند اور اولاد کی تواضع اور تربیت کی اسی طرح وہ بھی اپنے خاوند کی زندگی میں مہربانی اور ایثار سے بہاریں لائیں۔ ان کے خطوں میں داماد کی بطور شوہر ذمہ داریوں کا بھی احساس پایا جاتا ہے۔ وہ خط تو اپنی بیٹیوں کو لکھتے ہیں مگر خط کی پیشانی پر ساتھ داماد، ان کی پہلی بیوی اور بچوں کو بھی بڑے پیار سے مخاطب کرتے ہیں۔ ایک خط میں اپنا زندگی بھر کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

''سبق یہ ہے کہ گھروں کو چلانے اور اس کو قائم رکھنے کے لیے سب کو برابر کوشش کرنی چاہیے ورنہ سب کچھ گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ اور پھر واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔ اگر کوئی ایک فرد

زیادتی کرے تو دوسرے صبر کریں۔ معاملات پر غصہ کرنے کے بجائے گفت و شنید کریں۔ دلوں میں گرہیں نہ پڑنے دیں۔ جو کچھ ہے اس پر شکر ادا کریں اور جو کچھ نہیں ہے اس کی آرزو نہ کریں۔ تم پر اللہ کی رحمت ہے کہ تمہارے گھر میں انصاف اور معقولیت ہے سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر کسی میں کوتاہی ہے تو اسے معاف کرتے ہیں۔ اللہ تم لوگوں کو استقامت بخشے۔" (ص:۹۷)

ان تمام خطوں میں ان کا رویہ ایک صلح جو اور متوکل انسان کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ اپنے کالموں اور متعدد خطوں میں کمیونسٹ ہونے کا دعویٰ کرنے والا احمد بشیر اس احمد بشیر سے کس قدر مختلف ہے۔ اس کا اندازہ ان خطوں کے علاوہ ان خطوں سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے بیٹے ہمایوں بشیر کو امریکا میں لکھے۔ ان خطوں کا احمد بشیر بیٹیوں اور دامادوں کو لکھے گئے خطوط میں سے جھانکنے والے احمد بشیر سے جدا ہے۔ ہمایوں کے نام لکھے گئے خطوط سے ایک ایسا محبت کرنے والا باپ سامنے آیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

"اللہ کا شکر ہے۔ مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ میرے چاند کی روح بہت پاکیزہ اور نرم ہے مگر لڑکپن ہے، جلد نکل جائے گا۔ تو تم میری امیدوں کے مطابق پھل پھول رہی ہو اور اپنی ذہانت کی وجہ سے معاملات کو اور بھی اچھی طرح سے سمجھنے لگو گے۔ کبھی مشقت اور محبت بھی تمہیں مزہ دینے لگے گی۔ آدمی جب اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا ہے یا اپنے فیصلے کرتا ہے تو اس سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ مگر اس کا فرض ہے کہ وہ ان کا حساب رکھے۔ تخلیقی قوتیں عمل اور سوچ بچار ہی سے نکھرتی ہیں اور تخلیقی قوتوں کا مطلب ایجاد کرنا نہیں بلکہ رویوں میں اور زندگی کی حقیقتوں میں نئے راستے نکالنے ہیں۔ جس سے سکھ اور سکون میں اضافہ ہو" (ص:۸۵)

عملی زندگی میں کبھی کسی دفتر میں معمولی کلرکی، کبھی صحافت، افسری کبھی ریڑھا بانی اور مزدوری اور کبھی فلم سازی؛ فکری سطح پر مذہبی جماعتوں اور ملائیت اور نام نہاد اشتراکیت سے بیزار، نام نہاد ترقی پسندوں سے نفور و دور۔ کہیں ملوک کے دشمن املاک کے بیری۔ یہ سب کچھ انھیں مجموعہ اضداد ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ مگر یہ سب عوامل دراصل وہ مراحل ہیں جن کو طے کر کے وہ اپنے شخصیت کے تکملے تک پہنچے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو کہ اپنے آدرشوں کی راہ میں آنے والے پہاڑوں کو عبور کرتے ہوئے لمحہ بھر نہیں سوچتے۔ ان کے فکر و عمل اور آدرشوں کی راہ میں مطلق العنان طاقتوں کے

پہاڑ آئے مگر وہ ان کا راستہ نہ روک سکے۔

احمد بشیر اور امریکا:

احمد بشیر فکری اعتبار سے غالب معنوں میں سوشلسٹ خیالات کے حامل تھے مگر انھوں نے امریکہ میں قیام کے دوران اس معاشرے کو تعصب کی عینک سے نہیں دیکھا بلکہ ان کے تعلیمی اداروں کے ماحول اور اس کی خوبیوں پر وہ امریکن سوسائٹی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اپنی اہلیہ کو امریکہ سے خطوط میں امریکنوں کے طرز زندگی کے تذکرے سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ چند اقتباسات دیکھیے:

"..... یہاں کے لوگ بہت ہی اچھے ہیں ..... بالکل تعلیمی اور نیکی کا ماحول ہے۔ امن اتنا کہ رات کے دو بجے بھی جنگل میں نکل جاؤ تو کچھ خطرہ نہیں ـــ زندگی اتنی پرسکون اور ذہنی طور پر آسودہ ہے کہ حیرت ہے۔ یعنی کوئی مشکل ہی نہیں۔" (ص:۹)

"امریکن بہت اچھے لوگ ہیں۔ بہت بھولے اور بے وقوف۔ ان کو دنیا کا کچھ علم نہیں۔ ہم لوگ بہت چالاک اور ذہین ہیں۔" (ص:۵۳)

ان خیالات کا اظہار کرنے والا کوئی نوجوان لڑکا نہیں بلکہ ایک ایسا شخص ہے جو ایک ذمہ دار افسر ہے۔ ایک وسیع المطالعہ اور دبنگ صحافی ہے۔ جس نے اپنی زندگی کے لیے اس نظام فکر کی تفہیم اور تشریح کرنے کا انتخاب کرلیا ہے جس نے وسطی ایشیا اور مشرقی یورپ کے استعماری نظام کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ جیسے وہ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے کردار پر بے لاگ تنقید کرتے ہیں۔ پاکستان کے ترقی پسندوں کی ذاتی منفعت پسندی اور انتہا پسندانہ رویوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اسی طرح وہ سرمایہ دارانہ نظام کو انسانیت کا دشمن سمجھتے ہیں۔ مگر اس سوسائٹی کی وہ حسنات جن سے پاکستانی معاشرہ محروم ہے، وہ ان کی تعریف کرتے ہیں بلکہ بڑی فراخ دلی سے ان کا قلم امریکا کے لوگوں کے رہن سہن پر اظہار خیال کرتا ہے۔ ان کا یہ رویہ ان کی حقیقت پسندی پر دال ہے۔ ایک اور خط میں انڈیانہ یونیورسٹی میں قیام کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

..... زندگی یہاں اتنی پرسکون اور آہستہ ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ کوئی اور ہی دنیا ہے۔ اس یونیورسٹی میں بارہ ہزار طالبعلم ہیں اور پینسٹھ ملکوں سے آئے ہوئے ہیں۔ ..... یہاں کی عجیب رسم ہے کہ ہر آدمی یا عورت جو بھی سڑک پر ملے، ہیلو یا گڈ مارننگ کہے بغیر نہیں گزرتا اور ہر آدمی پر وقت مسکراتا ہے چاہے اسے تم جانو نہ جانو۔ ادب آداب کا یہ حال ہے کہ کوئی آدمی گالی تو چھوڑ معمولی سا سخت لفظ یعنی ڈیم تک نہیں کہتا۔ نہایت مہذب اور نرم گفتگو کا رواج ہے۔ پروفیسر

ایسے ہیں کہ بیان سے باہر۔ ان کی بیویاں بچے ہمیں گھر بلاتے ہیں اور گپ مارتے ہیں۔ یعنی معلوم ہی نہیں ہونے دیتے کہ یہ کوئی غیر ملک ہے۔ ہر آدمی بے چین رہتا ہے کہ تم آؤ تو دروازہ کھولے۔ کمرے کھلے رہتے ہیں لیکن چوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غرضیکہ جنت میں جیسے فرشتے ہوتے ہیں ویسے ہی یہ لوگ ہیں۔ واقعی اگر دنیا پر راج کرتے ہیں تو ان کا حق ہے..... ہر لڑکے اور لڑکی کے پاس کار ہے اور ہر آدمی لفٹ دینے کے لیے تیار ہے۔ غرضکہ عجیب لوگ ہیں کپڑے بڑے عمدہ پہنتے ہیں۔ ہر روز نہاتے ہیں۔ بڑی جلدی سوتے ہیں اور بہت سویرے اٹھتے ہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ کس دنیا میں آ گیا ہوں۔ بس یہاں تھوڑی بہت اداسی تمہاری ہے ورنہ میں تو یہاں عمر گزارنے پر تیار ہوں۔....."

(ص:۱۳،۱۴)

عام طور پر امریکا اور دیگر یورپی ممالک میں تہذیب کا جو معیار ہے ہمارے ہاں اسے بے حیائی اور بے راہروی کا نام دیا جاتا ہے اس زمانے میں انگریزی فلموں سے وہاں کے ماحول اور تہذیب کا پتا چلتا تھا۔ احمد بشیر جس امریکن یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اس کا پہلے دن کا احوال ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:

"یونیورسٹی کی زندگی بڑی پاکیزہ اور صاف ستھری ہے۔ دس بجے سے زیادہ باہر رہنا بہت بری بات ہے۔ اس لیے لڑکے زیادہ تر یونیورسٹی ہی میں رہتے ہیں اور یہاں تعلیمی زندگی ہے۔ ہمارے استاد اتنے اچھے ہیں کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب کل ہم یہاں پہنچے تو ہمارے سوٹ کیس اٹھا لیے اور لے کے ہمیں ہوسٹل خود پہنچایا۔ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہے کہ ہمیں کوئی تکلیف نہ ہو بلکہ خدمت پر آمادہ ہیں۔ پڑھائی صبح آٹھ بجے شروع ہو جاتی ہے۔" (ص:۱۶)

مودی بیگم کے نام ایک اور خط میں امریکی زندگی کے ایک اور رخ پر یوں رقمطراز ہیں:

کھانا یہاں کا سخت بے مزہ اور تکلیف دہ ہے اور پانی کوئی پیتا ہی نہیں۔ میں جب چار گلاس پیتا ہوں تو ہوٹل والے حیران ہوتے ہیں۔ مہنگائی اس غضب کی ہے کہ ہوش گم ہو گئے ہیں ..... معمولی ناشتے پر ساڑھے سات روپے خرچ آتے ہیں۔ قلی سوٹ کیس اٹھانے کے لیے تین روپے لیتا ہے مگر امریکنوں کو کوئی تکلیف نہیں کیونکہ یہاں نائی سو روپے روز کماتا ہے بلکہ زیادہ۔ ..... میرے کمرے کا کرایہ ساڑھے چار سو روپے ماہوار ہے۔ (۱۴)

امریکہ میں انھیں کھانے کی بہت مشکل تھی۔ یہ مشکل آج سے کم و بیش چالیس پچاس سال پہلے تک ہر غیر اسلامی ملک میں ہر پاکستانی کو پیش آیا کرتی تھی۔ امریکہ میں

قیام کے دوران ان کی توجہ اپنی پڑھائی پر مرتکز رہی۔ وہاں انھوں نے دستیاب وسائل میں بہت سلیقہ مندی اور کفایت شعاری سے گزارا کیا۔ جس کا تذکرہ ان کے خطوں میں کہیں کہیں صاف اور سادہ الفاظ میں ملتا ہے۔ چند اقتباسات دیکھیے:

''کھانے سے عاجز آ گیا ہوں - روز بدبھیڑوں کا شوربہ اور چربی میں اُبلے ہوئے ٹماٹر کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں۔ گوشت ہمیشہ کچا ملتا ہے لیکن دودھ بہت عمدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں چاول ڈال کر کھاتا ہوں۔'' (۲۹)

'' شہر آفت کی طرح بڑا ہے۔ کہیں آ جا بھی نہیں سکتے۔ ہفتہ اتوار دو چھٹیاں ہوتی ہیں۔ شہر میں کوئی نہیں رہتا۔ سب لوگ سیر کرنے یا نہانے بیچ پر چلے جاتے ہیں۔ مگر میرے پاس چونکہ کار نہیں اس لیے کہیں نہیں جا سکتا۔ (۴۸)

''اس وقت شام کے چھے بجے ہیں اور صبح سے نکانے کے خوف سے بھوکا بیٹھا تھا۔ پھر تھوڑی دیر پہلے مسور کی دال اور کھچڑی نکالی۔ نمک زیادہ پڑ گیا، اس لئے دہی ڈال کر کھائی۔ ابھی برتن دھونے کو پڑے ہیں اور باورچی خانے میں ہڈیاں، پیاز کے چھلکے، جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگا ہے۔ ڈر کے مارے ادھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔۔ (۴۹)

انھوں نے امریکہ میں بھی اپنے گھرانے کو خاص طور پر اپنی پیاری مودی بیگم کو ہر جگہ، عسرت و یسرت میں ہمہ وقت یاد رکھا۔ بلومنگٹن سے کیلی فورنیا آنے پر جب اپنی تنخواہ انھیں امریکا کے مطابق ملنے لگی تو ان کو کافی آسودگی میسر آئی مگر ذہنی طور پر وہ ہمیشہ کی طرح خود کو تنہا محسوس کرتے رہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

'' میرا گھر بہت خوبصورت ہے۔ ایسا گھر کبھی نہیں ملا اور شاید کبھی نہ ملے۔ باورچی خانہ جیسے جنت۔ باتھ روم جیسے فلموں میں ہوتا ہے۔ ڈریسنگ روم، ڈرائنگ روم، بیڈ روم، سب کمال ہے۔ جگہ جگہ قالین بچھے ہیں۔ فرجڈیئر، شیشے، کھڑکیاں، الماریاں، خوب معلوم ہوتا ہے۔ بستر بہت بڑا ہے اور ایسا جو صبح اٹھ کر دیوار میں چھپ جاتا ہے۔ اور الماری بن جاتا ہے۔ اس وقت میں اکیلا بیٹھا ہوں۔ سوچتا ہوں تم ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں اور گھر کو دیکھ دیکھ کر ساری رات جاگتی رہیں۔ میں بھی جاگتا رہوں گا مگر گھر کو دیکھ کر نہیں بلکہ تمھیں یاد کر کے۔۔'' (ص:۵۴)

احمد بشیر کے آدرش:

گھر میں ان کی راہ کا سب سے بڑا پہاڑ ان کا بیٹا ہمایوں (ہومی) تھا۔ وہ ایک کامیاب انسان بننا چاہتا تھا۔ جیسا کہ جنریشن گیپ نئی نسل کا طرۂ امتیاز ہوا کرتا ہے۔ ہمایوں کو اپنے آدرش ورثا باپ سے زندگی بھر

اختلاف رہا۔ احمد بشیر نے جو خطوط ہمایوں کو لکھے۔ اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ یہ ان کی تحریروں کو کہیں استناد بخشتے ہیں تو کہیں ان کی فکر کو مزید واضح کرتے ہیں۔ ان خطوط میں بھی ان کی دیگر تحریروں کی طرح مصلحت اور مصالحت کے بجائے فکر انگیز تنقید اور تاریخ کے تناظر میں تجزیے ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے خطوط میں مختلف شخصیات کے کردار پر اور شخصیات سے ان کے تعلقات کی نوعیت اور نہج کا بھی پتا چلتا ہے۔ یہ خطوط احمد بشیر کے آدرشوں سے آگہی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ گہرے مطالعے کا مرقع ہیں۔ ان خطوط میں احمد بشیر کے افکار کا جو پہلو ان کی دیگر تحریروں سے سوا ہے وہ ہے ان کا عقیدہ۔ ہمارے ہاں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جو ترقی پسند ہے وہ مادر پدر آزاد ہے وہ لادین بلکہ بے دین ہے۔ شاید ایسا سمجھنے والوں کے پیش نظر اینجلز اور لینن کی وہ تقاریر ہو جن میں کہا گیا تھا کہ وہ کسی ابدی اخلاق پر یقین نہیں رکھتے اور اخلاقیات وہ ہے جو سوشلسٹ معاشرہ خود تشکیل دے گا۔ ہم روایات کو نہیں مانتے اور یہ کہ اشتراکی آخرت میں کسی محاسبے کے قائل نہیں۔ (اقبال اور سوشلزم، ص: ۳۲، ۳۳) اس پر طرہ یہ بھی کہ خود ترقی پسندوں نے بھی کچھ ایسی سرگرمیاں دکھائیں جو عمل کا شدید تر اور غیر ضروری ردعمل تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسندی مخصوص کمیونسٹ سیاسی اور سماجی غرض و غایت کی پیروکار بن کر رہ گئی۔ ممتاز نقاد اور ادیب عزیز احمد نے اسی لیے کہا تھا کہ ترقی پسند تحریک کو جس قدر نقصان خود ترقی پسند تحریک نے پہنچایا رجعت پسندوں نے نہیں پہنچایا۔ ان کے خطوط میں جس ترقی پسند احمد بشیر کا سراپا ابھرتا ہے وہ اسی ترقی پسند تحریک کا حامی ہے جس کے منشور کو اقبال اور ٹیگور نے سراہا تھا۔ شاید یہی باعث ہے کہ احمد بشیر کو مسلم لیگی نہ ہونے کے باوجود بطور ایک پاکستانی، قائداعظم اور اقبال سے دلی وابستگی ہے۔ وہ پاکستان اور قائد پر کسی فیشن کے تحت تنقید نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو لکھے گئے خطوط میں بالخصوص اور دیگر احباب اور اہل خانہ کو لکھے گئے خطوط میں عام طور پر اپنے آپ کو ایک متوکل مسلمان قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر ان کا ایمان راسخ ہے مگر ملائیت کے تخلیق کردہ شریعت سے بیزار ہیں۔ بقول اقبال ع دین ملائی سبیل اللہ فساد۔ اقبال نے نوجوانوں کو قرآن کے معاشی نظام کا مطالعہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل اکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں مجھے یقین

ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اسی کتاب میں پائیں گے۔" اس سے پہلے انھوں نے اپنی نسبت بالشویک افکار کی حمایت سے بریت کا اعلان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔۔۔"

(مراسلہ بنام ایڈیٹر روزنامہ "زمیندار" مؤرخہ ۲۴۔ جون ۱۹۲۳ لاہور)

اسی خط میں انھوں نے مغربی سرمایہ داری اور روسی بالشویزم، دونوں کو افراط و تفریط کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اور قرآن کی تجویز کردہ اعتدال کی راہ کو ناجیٔ روزگار بتایا ہے۔ وہ اس بات پر تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو کسی اور نظام کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ مگر احمد بشیر کو یقین ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے مقاصد ایک ہیں۔ چنانچہ ان کے حصول کے لیے اشتراکیت کا نظام اپنی اصلاح کے بعد دوبارہ پوری توانائیوں کے ساتھ اقوام کے معاشی مسائل کے حل کے لیے نفوذ کرے گا۔ دیکھیے کیا کہتے ہیں:

میں نے قرآن کے علاوہ تاریخ اسلام، فکر کی اسلامی تحریکیں، تورات، انجیل اور مہابھارت اور گوتم بدھ کے بارے میں بھی پڑھا ہے۔ یہودیت ایک نسل پرست مذہب تھا۔ عیسائیت فقط محبت پر زور دیتی ہے اور چونکہ غیر مشروط ہے اس لیے قابل عمل نہیں۔ اسلام کی مرکزی تعلیم سوشل جسٹس یعنی اجتماعی عدل ہے۔ عبادات اور تقریرات بنیادی حیثیت نہیں رکھتیں ۔۔۔ قرآن میں، جسے میں ایک عقلی کتاب مانتا ہوں اور جس نے دنیا کو یونانی فکر سے آزاد کر کے تاریخ کا پہلا انقلاب کیا۔ والدین کا مقام، نبیوں کے بعد مقرر کیا گیا۔۔۔ مکے شریف جانے کی آرزو میرے دل میں ہمیشہ سے تھی مگر بغرض ثواب نہیں بلکہ اس شہر کی تاریخی اہمیت کے خیال سے۔ یہاں دنیا کا سب سے بڑا انقلابی پیدا ہوا اور جیا۔ دوسرا انقلاب، انقلاب فرانس تھا۔ تیسرا بڑا انقلاب سوشلسٹ انقلاب تھا جو ابھی کامیاب نہیں ہوا مگر جسے لوٹ کر اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے آنا ہی ہے۔ اس کے مقاصد بھی عدل اجتماعی کے ہیں جو اسلام کے مقاصد ہیں۔ (خط بنام ہمایوں بشیر۔ ص:۹۱)

احمد بشیر کا یہ طویل ترین خط ان کے اسلام کے مقاصد پر وہی روشنی ڈالتا ہے جو کہ اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے:

یہی مقصد فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی

.....

[جاری ہے۔]

سفرنامہ ولایت چلتے ہیں۔۔۔ایک تاثر

سفرنامہ نگاری کی اردو روایت کا سرا یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے ''عجائبات فرنگ'' سے جا کر ملتا ہے۔ یہ انیسویں صدی کا قصہ ہے اور اب مشرف مبشر کا سفر نامہ بھی اسی لندن اور ولایت کے حوالے سے سامنے آیا ہے، یہ قریباً دو سو سال کے زمانی بعد رکھتے ہیں، میں یہاں ان کا موازنہ نہیں کرنے جا رہا لیکن یہ اتفاقات یقیناً قاری کو ایک پس منظر ضرور فراہم کریں گے کہ ولایت کے حوالے سے یہ پہلا سفر نامہ نہیں اور یقیناً پروفیسر صاحبہ چونکہ اردو ادب کی پروفیسر ہیں ظاہر ہے کہ تاریخی سفر نامہ ان کے پیش نظر رہا ہوگا۔ اردو سفر نامہ نگاری کی روایت کا سرسری جائزہ یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اردو ادب میں سفر نامہ کی جاندار اور شاندار روایت موجود ہے اور پروفیسر مشرف مبشر کا یہ سفر نامہ ''ولایت چلتے ہیں'' ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ میرا اس سفر نامہ نگار سے پہلا تعارف ڈاکٹر بسمینہ سراج کی کتاب ''خیبر پختونخوا میں خواتین افسانہ نگار'' سے ہوا تھا، ڈاکٹر بسمینہ سراج ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھتی ہیں:

''مشرف جبین یکم نومبر ۱۹۴۲ء کو پشاور میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم پشاور میں حاصل کی۔ ۱۹۶۴ میں بی۔ آنرز کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۶۵ میں ایم اے کا امتحان پشاور یونی ورسٹی سے پاس کیا۔ عملی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے کیا۔''

سفر نامے کی طرف بات بڑھاؤں تو یہ ایک متاثر کرنے والا سفر نامہ ہے کہ جو اساتذۂ فن کی متعین کردہ شرائط پر پورا اترتا ہے۔ پروفیسر مشرف مبشر کا اسلوب ہی اس سفر نامہ کی خاص خوبی ہے، میرا موضوع بھی ان کا اسلوب ہی ہے کہ مجھے اس

عادل سعید قریشی

سفرنامے میں مصنفہ کا سلیس و رواں اسلوب نگارش نے متاثر کیا ہے۔ اسلوب کی بحث خاصی گنجلک و تجریدیت کی حامل ہوتی ہے لیکن خود اسلوب اسی قدر واضح اور شناخت رکھنے والا ہوتا ہے کہ بیک نگاہ پہچان لیا جا سکتا ہے۔ استاد مکرم جناب پروفیسر صوفی عبدالرشید فرمایا کرتے تھے کہ میر، درد، غالب، مومن، مصحفی، ناسخ و آتش ایک ہی صنف شعر اور ایک ہی زبان کے شاعر ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ پہچان رکھتے ہیں تو اس پہچان کی ایک وجہ ہے اور وہ ان کا اسلوب ہے۔ میرا ماننا بھی یہی ہے کہ جیسے ایک ہی زبان اور ایک ہی صنف نثر میں اگر انشا پردازوں کے انداز کے اختلاف سے ہم ان کو ایک دوسرے سے الگ پہچان سکتے ہیں تو اس کا سبب سوائے اسلوب نگارش کے کچھ بھی نہیں ہے۔

پروفیسر مشرف مبشر کے اسلوب کا جہاں تک تعلق ہے تو میں ان کی کتاب ''ولایت چلتے ہیں'' کے حوالے سے ہی اپنی بحث کو آگے بڑھاؤں گا اور ان کے اسلوب کے تین پہلو اپنے اس مختصر مضمون میں بیان کرنے کی سعی کروں گا گو کہ کسی ایک ادیب یا شاعر کے اسلوب کی بحث میں کئی پہلو پیش نظر رکھنے پڑتے ہیں مثلاً اس صنف نظم و نثر کا تعین، اساتذہ کرام کے مقرر کردہ اصول و قواعد، کلاسیکی روایت کی پڑتال اور پرکھ، تخلیق کار کی انفرادیت، موضوع کی برت اور موضوع کا پس منظر، تخلیق کار کا مطالعہ، لفظیات، انفرادی رجحان وغیرہ۔ میں یہاں مشرف مبشر کے اسلوب کی (۱) سلاست (۲) افسانوی رنگ اور (۳) ان کے تاریخی شعور کو زیر بحث لاؤں گا۔ ''ولایت چلتے ہیں'' کے پہلے چند صفحات سے ہی قاری کو معلوم پڑ جاتا ہے کہ مصنفہ کا اپنے اسلوب کی ریڑھ کی ہڈی یعنی زبان ہے اور اس پر مشرف مبشر کو کامل عبور حاصل ہے اور وہ اپنے قاری کے لیے زرومرہ کی زبان کو برتتی ہیں، یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ادیبوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، اول وہ ادیب جو اپنی بات کے ابلاغ کے اس قدر حریص ہوتے ہیں کہ وہ اپنے مطلب براری کے لیے زبان کی سلاست کو قربان کر دیتے ہیں۔ دوسری قسم ادیبوں کی ایسی ہوتی ہے جن کو ہم قاری دوست تخلیق کار کہتے ہیں، یہ لکھاری وہ ہوتے ہیں کہ جو اپنی بات کی تفہیم کے حریص تو ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے قاری کی ذہنی سطح اور اس کے ذوق کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں، مشرف مبشر اپنے سفرنامے ''ولایت چلتے ہیں'' میں ایسی ہی قاری دوست مصنفہ کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ انھوں نے سارا سفرنامہ ایک طرح سے کنٹری کے انداز میں لکھا ہے۔ اردو زبان پر ان کا عبور اس سفرنامے کی سطر سطر

سے معلوم ہو رہا ہے:

''لندن کی سیر و تفریح کتابی اور فلمی دنیا سے نکل کر تاریخی عمارات، معروف تاریخی عجوبوں کو دیکھنا اور اس کے گلی کوچوں کی خاک چھاننا، عجب تجسس اور ولولہ تھا۔ سیر و سیاحت کہیں کی ہو بھولنے والی شے نہیں۔ تاہم ایک دو چند نقوش انمٹ ضرور ہوتے ہیں جو زندگی بھر ساتھ رہتے ہیں۔ عجائبات والے شہر لندن کے دریائے تھیمز کے کنارے ایک رات کا دلفریب نظارہ اور اس روح پرور کیفیت کا الوہی نقش لوحِ دل پر بسائے ساتھ لے آئے ہیں۔'' (ص ۲۴)

مشرف مبشر کا لسانی شعور اس سفرنامے سے جس طرح ظاہر ہوتا ہے اس سے مصنفہ کا زبان پر عبور اور وسیع مطالعہ کا پتا چلتا ہے، مصنفہ نے بڑی سنجیدگی اور توجہ سے اپنے سفرنامے کو لکھا ہے۔ اس کے پاس مضبوط زبان اور فعال اردو محاورہ کے آثار ملتے ہیں۔ ساری کتاب میں سلاست، روانی اور زبان کی لطافت ملتی ہے۔ ان کا اردو زبان کے ساتھ ایک طویل رشتہ ہے اور اس کا عملی ثبوت اسی سفرنامے میں ملتا ہے۔

پروفیسر مشرف مبشر کے اسلوب کا دوسرا اہم جزو ان کا افسانوی رنگ ہے، جیسا کہ معلوم ہے کہ موصوف کے تین افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں اور ان کی پسندیدہ صنف نثر بھی افسانہ ہی ہے اور ان کا اپنا مزاج بھی افسانے کی طرف ہی ہے لہٰذا ان کے اس سفرنامے میں بھی افسانوی رنگ نمایاں ہے۔ اس سفرنامے کا ابتدائیہ ہی دیکھ لیں:

''برٹین آکر ویلز کے مضافات کے دلکشا مناظر اور روح افزا ماحول نے کچھ ایسے مسحور کر رکھا تھا کہ کہیں اور جانے کو جی نہیں کرتا تھا جبکہ لندن دیکھنا بھی ضروری تھا۔ ''انگلینڈ گئیں اور لندن نہ دیکھا---!'' دوستوں کی اس حیرت کا کیا جواز پیش کیا جاتا۔ ادھیڑ عمری، حوصلہ نہ دلیری اور نہ ہی زیادہ ہوشیاری۔ دھڑکے، دل ناتواں کے لیے بہت تھے۔ داماد من ڈاکٹر شوکت حیات خان لندن یاترا کے لیے ہمت بندھاتے رہے، حوصلہ بڑھاتے رہتے۔ ڈانوال ڈول کیفیت میں عجب شش و پنج کی کیفیت بدستور طاری رہی۔'' (ص ۱۲)

وہ کہتے ہیں نا کہ ایک اچھا افسانے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا آغاز اپنے قاری کو پہلے جملے سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، اسی طرح یہ بھی مانا گیا ہے کہ افسانے کی ایک بڑی خوبی اس کا پہلا جملہ ہی ہوتا ہے کہ جو قاری کی توجہ کو حاصل کر لیتا ہے۔ سفرنامہ ''ولایت چلتے ہیں'' میں مشرف مبشر نے جابجا افسانے کی ٹیکنیس برتی ہیں۔ ان کا افسانہ نگار ہونے کے قرائن ان کے اس سفر نامے میں جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی

لفظیات بھی افسانوی رنگ ڈھنگ رکھتی ہیں۔ اسی طرح سفرنامے میں وہ تجسس، موڑ (twist)، قاری کی دلچسپ کا اہتمام، کہانی پن کا بگھار، کفایت لفظی سے نئے معانی پیدا کرنا، منظر کشی، جذبات نگاری، جزئیات نگاری پر خاص توجہ دیتی ہیں۔ ان کا یہ سفرنامہ خصوص سے ایک افسانوی فضا رکھتا ہے۔ دریائے تھیمز پر ایک رات کا منظر کشی دیکھیے:

''رات بارہ بجے واک پر نکلے، رات چاندنی تھی۔ کھلی صاف ستھری گلی سے گزرتے ہوئے ایک بڑی سے حویلی نما عمارت کے سامنے ٹھہر گئے۔ خاموشی کا راج ہر شے پر محیط تھا۔ حویلی کے وسیع صحن میں ایک دائرے کی صورت میں چراغ جل رہے تھے، چراغاں کی بہار تھی۔ سماں دھندلا تھا۔ آس پاس چرند پرند نہ کوئی آدم زاد — فسوں ساز جادوئی ماحول تھا۔ کھلے دروازے کی اوٹ سے نظارہ کیا۔ آگے بڑھنے، اندر جھانکنے کا حوصلہ نہ تھا۔ ڈوبی ڈوبی ہنسی اور دبے دبے قہقہوں نے ماحول کو کچھ زیادہ ہی پر اسرار بنا دیا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس گلی کے آخری نکڑ سے باہر آ گئے۔ آسمان کی لامتناہی وسعت میں ہلکی ہلکی سیاہی کے ساتھ چاندنی کا نور تا حد نظر پھیلا ہوا تھا۔ سامنے دریائے تھیمز تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کا محبوب تھیمز کہ جس کے کنارے انگریزی ادب تخلیق ہوا۔''(۴۶)

اس طرح اس سفرنامے میں مشرف مبشر کی عمیق نگاہی اور مشاہدہ کی مضبوط قوت کا بھی پتا چلتا ہے، وہ ایک ماہر سیاح اور داستان گو کی طرح جہاں جہاں سے گزری ہیں وہاں وہاں کا حال نہایت معروضیت اور اختصار کے ساتھ قلم بند کرتی گئی ہیں۔ ان کی نظر جس جس چیز پر پڑی اس کو انھوں نے موضوع بنایا ہے، یہ بھی نہیں کہ وہ پہچان نہیں کر پاتیں اور سب لکھتی جاتی ہیں، نہیں ایسا تو بالکل بھی نہیں ان کا ذوق اور ان کا تجربہ ان کو اس حوالے سے خوب رہنمائی دیتا ہے، ''ولایت چلتے ہیں'' میں انھوں نے خود کو حشو وزوائد سے حتی المقدور دور رکھا ہے۔ اپنے قاری اور اس کی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے سفرنامے کو ترتیب دیا ہے۔

مشرف مبشر کا یہ سفرنامہ ان کے تاریخی شعور کا پتا بھی دیتا ہے۔ تاریخی شعور کی علما اور ماہرین جانے کیا کیا تعریفیں کریں لیکن میرے نزدیک یہ تعریف ہے کہ مصنفہ کا تاریخی شعور ان کو تاریخ کے جھروکے میں لے جاتا ہے اور وہ جہاں جہاں سے گزرتی ہیں وہاں سے وابستہ تاریخ ان کے اپنے ذہن میں ابھرنے لگتی ہے اور پھر وہ اسی تاریخی حوالوں کو اپنی اس سیر کی روداد کے

دوران اپنے قارئین کے نذر کرتی جاتی ہیں۔ یوں ایک تو ان کا یہ سفرنامہ انگلینڈ اور لندن کی سفری روداد کے ساتھ ساتھ ایک زبردست تاریخی دستاویز کی صورت بھی اختیار کر جاتا ہے جس سے قاری اس کی قوم اور ملک کی تاریخ کے چند پہلوؤں سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ لندن کا تعارف کراتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

"۱۶۶۶ میں مسلسل چھے دن تک ہولناک آتش زدگی نے لندن کے بڑے حصے کو جلا کر راکھ کر دیا، اس آگ کے دوسو دو (۲۰۲) فٹ بلند شعلوں کی مناسبت سے آتش زدگی کی اس یادگار کو بھی دوسو دو فٹ بلند تعمیر کیا گیا۔" (ص ۱۶)

"ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ چوک سے ذرا ہٹ کر ایک کنارے پر تھا۔ سنگ سیاہ کے چبوترے کی اونچی کرسی پر ملکہ وکٹوریہ (۱۸۱۹-۱۹۰۱) اپنے مخصوص انداز میں براجمان تھیں۔۔۔ مسلمانانِ ہند سے انسیت کا دم بھرنے والی ملکہ وکٹوریا دستخط اردو میں کرتیں۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم پر کمپنی معطل کر دی۔ ہندوستان کو برطانوی مملکت کی عمل داری میں لے کر ہندوستانیوں کے لیے مکمل مذہبی آزادی اور بنیادی حقوق کے حوالے سے اصلاحات نافذ کیں۔ جسے آزادی ہند کا میگنا کارٹا کہا گیا۔" (۷۵)

اس طرح کے بہت سے حوالے اور تاریخی واقعات کو مشرف مبشر اپنے اس سفرنامے میں شامل کرتی جاتی ہیں۔ میں یہاں اس تاریخ کی آگاہی اور اس کی سفرناموں میں برت کو ان کا تاریخی شعور تصور کرتا ہوں۔ ان کا یہ سفرنامہ "ولایت چلتے ہیں" میں مصنفہ کا تاریخی شعور بلا شبہ داد خواہ ہے۔ یہاں یہ بات کہنے میں بھی مجھے باک نہیں کہ سفرناموں میں تاریخ کا تڑکا واقعی قاری کو خوش گوار تاثر دیتا ہے اور یہ سفرنامہ اس حوالے سے بھی خاص ہے کہ سفرناموں کی اس روایت کا حامل ہے جو اردو روایت کا کلاسیکی تسلسل ہے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے اگر اس سفرنامے کے اسلوب کا مجموعی احاطہ کروں تو "ولایت چلتے ہیں" ایک مثالی اسلوب کا حامل سفرنامہ ہے، جس میں تخلیق کار کا وسیع مطالعہ، صنف نثر کی کلاسیکی روایت سے کماحقہ آگاہی، زبان پر عبور، افسانوی طرز بیان، تاریخی شعور کی برت، بیان کی پختگی، اختصار اور جامعیت کا حسین امتزاج اور سب سے بڑھ کر اپنے موضوع اور عنوان سے انصاف ملتا ہے۔ مشرف مبشر کا اسلوب اس صنف کے لیے نہایت موزوں ہے۔ میں اس سفرنامے "ولایت چلتے ہیں" کو اردو کے سفرناموں کے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ جانتا ہوں۔

☆☆☆☆☆

حامد یزدانی کا افسانوی جہاں اور 'خالی بالٹی'

حامد یزدانی پاکستان کے معروف شاعر اور منفرد افسانہ نگار ہیں۔ گو یہ رہتے کینیڈا میں ہیں، مگر ان کا دل پاکستان میں بستا ہے۔ انھیں پاکستان چھوڑے مدت ہوگئی، مگر انھیں آج بھی لاہور کا محلّہ مزنگ، باغِ جناح، گورنمنٹ کالج، مال روڈ، حلقۂ اربابِ ذوق اور ٹی ہاؤس کی علمی و ادبی یادیں تڑپاتی ہیں، اور انھیں یادوں میں انھوں نے جرمنی اور کینیڈا میں اردو ادیبوں، شاعروں کے لیے حلقۂ اربابِ ذوق کو فعال اور متحرک بنائے رکھا۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

نمک شناس اسیراں چو از قفس رستند
بہ نخلِ خانۂ صیاد آشیاں بستند

.....

حامد یزدانی کے دیرینہ دوست زاہد حسین نے بجا کہا کہ حامد یزدانی کی رومانوی ماضی پسندی (Romantic Nostalgia) نے یادوں کی خوب رونق لگا رکھی ہے۔ زیرِ نظر کتاب ''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے'' پاکستان کے نظریے، محلوں، اداروں اور گلیاروں کی روداد ہے،

یوسف عرفان

جس کو دل پزیر فنی معیار کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔ افسانوں کے کردار حقیقی ہیں، اور موضوعات بھی محض خیالی آواری گردی نہیں ہیں۔ یہ حامد یزدانی کا فنی کمال ہے کہ وہ کردار کے بغیر بھی افسانہ لکھتے ہیں، اور اپنی ذات کو بھی جداگانہ ہمزاد کی تمثیل میں ڈھال کر بھرپور فکر و عمل کی تصویر بنا دیتے ہیں۔ ان کے افسانے انسانی زندگی، دنیا اور دل و دماغ کی پیچیدہ گتھیوں کو سادہ مگر دل چسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں خالقِ کائنات اور اس کی قدرت قادرہ، نیز ماوق الفطرت باتوں کو بھی عام دل نشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

فی الحقیقت، حامد یزدانی کی 'خالی بالٹی' حقیقت اور خیال کا حسین امتزاج ہے، جس نے اردو کے افسانوی ادب کو نئی راہوں اور نئے رویوں سے آشنا کیا ہے۔ حامد یزدانی کے افسانوں کی دوسری فنی خوبی یہ ہے کہ ان کی فکر مشرقی ہے، مگر طرزِ نگارش مغربی ہے، جس میں مغرب کی تحلیلِ نفسی اور فکری مہملیت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کو پڑھتے ہوئے قاری کو ورجینیا وولف اور ٹی ایس ایلیٹ بھی یاد آتے ہیں۔ حامد یزدانی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے فکر و عمل کی خیال آرائی کے باوجود مغرب کی خیالی اور عملی مہملیت سے یک سر اجتناب کیا ہے۔ ان کے افسانے زندگی اور زندگی نامہ ہیں۔ وہ انفرادی، اجتماعی اور عالمی زندگی کو فکر و فن میں لا کر لازوال بنا دیتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنے افسانوی کرداروں کو زمان و مکان کی ہمیشگی عطا کر دی ہے۔ ان کے افسانے 'خاکی تھیلا' نے کینیڈا کی زندگی پر کرونا کے اثرات کو خوب بیان کیا ہے، اور اس کے ایک حقیقی کردار ڈاکٹر خالد سہیل کو بھی امر کر دیا ہے۔ یہ ایک خوب صورت شخصی اور خیالی خاکہ ہے۔ اسی طرح 'خالی بالٹی' کے کردار کریم بھائی اور Love Letter کے کردار پروفیسر ظہیر اور ان کی بیگم طلعت نے مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے اثرات کو لازوال محبت میں ڈھال دیا ہے۔ کتاب کا پہلا افسانہ 'دیوار' دیوارِ برلن کے انہدام اور دوسرا افسانہ 'خاکی تھیلا' کرونا کے عالمی اثرات کی کہانی ہے۔

No Stopping Zone کینیڈا میں موجود فلسطین کے پرعزم مسلمانوں اور اسرائیل کے خدمت گاروں کا حقیقت نامہ ہے۔ موضوع بھاری ہو سکتا ہے، مگر تحریر نہیں۔ حامد یزدانی نے بھاری بھرکم اور پیچیدہ باتوں اور مسئلوں کو بھی قاری کے لیے خوب صورت نغمہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی

طرح 'چار سدہ' کا سفر ایک مافوق الفطرت سفر کی داستان ہے، لیکن وہاں کے واقعات و معاملات کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی ہر فرد کی زندگی کی داستان ہیں۔ 'ایک جلاوطن شہر کا حزنیہ' بھی خوب ہے جس میں ضیا دور کے انقلابی و مزاحمتی اور بعد از ضیا دور کے مفاہمتی ادب نے سب کچھ بدل دیا۔ نہ شہر پہلے جیسا رہا، نہ ادبی حلقوں میں پہلے جیسی شان۔ جب حامد یزدانی لاہور آتے ہیں تو احمد مشتاق کے درج ذیل شعر کی تصویر بن جاتے ہیں۔ آس رہی نہ یاس، بلکہ شہر کی باس ان کا ذاتی اثاثہ ہوتی ہے:

جاتے ہوئے ہر چیز یہیں چھوڑ گیا تھا
لوٹا ہوں تو اک دھوپ کا ٹکڑا نہیں ملتا

.....

حامد یزدانی کا افسانوی جہاں حقیقی جہان سے جدا نہیں ہے، جس نے اپنے دور کے پاکستانی اور بین الاقوامی حالات، واقعات اور معمولات کو خوب صورتی سے بیان کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ کوئی افسانہ بے معنی نہیں ہے۔ یہ افسانوی کتاب حامد یزدانی کے فکر و عمل اور شخصیت کی نفاست، لطافت، محبت اور قرینے کی آئینہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حامد یزدانی صرف پاکستانی شاعر اور افسانہ نگار نہیں، بلکہ اپنے موضوعات اور ان کی مقبولیت کے لحاظ سے بین الاقوامی اردو ادب کے نمائندہ ترجمان بھی ہیں۔ یہ افسانے آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔ ان کے افسانوں کی یہ کتاب معروضی طور پر، یعنی غیر جانب داری سے زندگی، دین و دنیا، دوست احباب اور حالات کو دیکھنے اور سمجھنے سمجھانے کا سفر ہے، جس نے اردو افسانے کے کینوس کو یک سر بدل دیا ہے۔ وگرنہ قیامِ پاکستان کے وقت ہجرتی ادب نے یک رنگی اختیار کر کے عام قاری کی دل چسپی کو مستقل نہیں بنایا۔ جب کہ حامد یزدانی کے پاس ہجرتوں کی لذت، دوبارہ وصل کی عذاب نما خوشی اور دنیا کی چاہت، سب کچھ ملتا ہے، اور اسی ہمہ رنگی نے ان کی تحریر کو تنوع اور تازگی فراہم کی ہے، جس کو زوال نہیں۔

''خالی بالٹی اور دوسرے افسانے'' ہجرت یعنی وچھوڑے کی اس چہل قدمی کی یاد دلاتی ہے جو گورنمنٹ کالج لاہور کے مین گیٹ سے نکلتی وہ ابھرتی گھاٹی سے جس کے چار سو زرد اور سبز پتوں کی رونق ہے قاری کو حامد یزدانی کے مادرِ علمی کے شعر و ادب کی دنیا میں لے جاتی ہے اور کہتی ہے:

گفتگو کرتے ہیں رستے آہٹوں کے ساتھ ساتھ
جیسے باقی ہوں ابھی تک تیرے قدموں کے نقوش

☆☆☆☆☆

عورت کا استحصال

عورت کے حقوق کو محفوظ بنانے کیلئے دنیا کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں کسی نہ کسی شکل میں 'جنسی ہراسگی' کا تصور موجود ہے اس تصور کو مختلف معاشروں نے اپنے انداز میں قانونی شکل فراہم کی ہوئی ہے۔ اگرچہ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں 'عورت کی سماجی، معاشرتی وسیاسی ترقی' کے حصول کیلئے معاشروں نے اپنے تئیں کئی ایک اقدامات اُٹھائے ہیں - عورت جو زمانہِ قدیم میں قبائل کی حکمران ہوا کرتی تھی جس کی باقیات کا تصور اب بھی افریقی قبائل کی صورت میں کہیں نہ کہیں نظر آتا ہے، ہالی ووڈ نے چند سال قبل Wonder Woman کے نام سے ایک فلم بنائی ہے جس میں خواتین قبائل کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ اور ٹیکنالوجی سے لیس طاقتور ترین مخلوق اور قبائل کی سربراہ کے طور پر دِکھایا گیا ہے۔ اگرچہ خاتون کو طاقتور بنانے کا تصور خالصتاً مغربی نوعیت کا ہے، مغربی معاشروں میں یہ تصور اجاگر ہوا، خواتین نے اپنے حقوق کی بات ہے۔ انقلابِ فرانس کے بعد جہاں 'مردوں کے حقوق کا اعلامیہ' (1789) جاری ہوا وہیں 'خواتین کے حقوق کا اعلامیہ' (1791) کو جاری ہوا۔ خواتین کے حقوق کی باتیں کسی نہ کسی صورت میں ہوتی رہیں، مگر حیران کن حد تک یہ تحریک پہلی جنگِ عظیم کے دوران زور پکڑ گئی۔ جنگ جاری تھی کہ 'قومی خواتین پارٹی' کے زیرِ انتظام ہزاروں خواتین نے وائٹ ہاؤس کے گرد احتجاج کرنا شروع کردیا اور بینرز پر دلچسپ نعرے آویزاں تھے۔ 'اگر جرمنی خواتین کو ووٹ کا حق دے

جام سجاد حسین

سکتا ہے، تو امریکہ کیوں نہیں'۔ 'اگرچہ امریکہ جمہوری معاشرہ کہلواتا ہے مگر آدھے سے زائد آبادی کو شناخت کا حق ہی نہیں دیا جارہا'۔ یہ احتجاج امریکی سرکار کے لئے پریشان کن تھا اور اس قدر پریشان کہ امریکی سرکار نے پولیس کو خواتین کے ساتھ گتھم گتھا ہونے کی آزادی دے دی۔ پولیس نے بینرز پھاڑ دیئے اور انہیں دھکے دے کر وہاں سے ہٹانا چاہا۔ جب ایسا ممکن نہ ہوا تو پڑھی لکھی، مہذب اور شائستہ انداز میں احتجاج کرنے والی خواتین کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ یہ سب امریکہ کے اندر ہوا۔ خواتین کے حقوق کی بات کر خود امریکی پارلیمنٹ کے اندر مرد حضرات ہنسا کرتے۔ مگر پہلی امریکی بنیاد پرست مشتعل خاتون ایلیس پال نے امریکی صدر وڈرو ولسن کی تقریر کو آگ لگانے، خاتون مارچ پاسٹ، پریڈز اور دیگر اقدام اٹھانا شروع کر دیئے۔ اگرچہ امریکی انتظامیہ کو ان اقدامات سے کافی ہزیمت اٹھانا پڑی مگر ایلیس پال، انا ہووارڈ شاہ، کیری چیپ مین کیٹ اور دیگر مشتعل خواتین کے سبب امریکی سرکار نے 1920 میں خواتین کو ووٹ کا حق دے دیا۔ حقوق نسواں کی اس پہلی لہر نے دیگر دوسری اور تیسری لہر کی مضبوط بنیاد رکھ دی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران خواتین کے حقوق کے متعلق کئی کانفرنسیں ہوئیں، سیمینار منعقد ہوئے۔ بالآخر 1960-1970 کے دوران دوسری حقوق نسواں کی لہر چل پڑی جس کا سکوپ پہلی لہر سے کہیں بڑا تھا، خواتین نے اب وسیع تر قومی مفاد میں اجرت میں برابری، دفاتر میں مساوی سلوک، اور دیگر حقوق مانگنے شروع کر دیئے۔ آغاز میں حقوق کی طلب اس قدر واضح اور عقلی تھی کہ مردوں نے بھی خواتین کا ساتھ دینا شروع کر دیا اور کئی ریلیوں اور جلوسوں کے اندر مردوں کی کثیر تعداد خواتین کا ساتھ دیتی نظر آتی۔ یہ ساری داستان مغربی معاشروں کی ہے۔ پہلے خواتین کو سامراجی طاقتوں اور سلطنتوں نے خواتین کو مرعوب رکھا، حالانکہ ایک دور ہوا کرتا تھا جب خواتین دنیا پر راج کیا کرتی تھیں۔ اگر ہم لفظ Comedy کا تجزیہ کریں تو ہمیں قدیم رومن سلطنت کے اندر خواتین کا کردار نمایاں نظر آتا ہے کہ کس انداز میں خواتین کا عروج حاصل تھا اور مرد اُن کے قریب جانے کیلئے خواتین کے من پسند بول (شاعری اور گانے) بولا کرتے تھے اور خود خواتین بڑی سواریوں (اونٹ، گھوڑے اور گھیاں) میں سوار ہو کر میلوں میں جایا کرتیں اور من پسند مرد حضرات کو اپنی طرف راغب کرتیں اور ساتھ وقت گزارنے اور مردانگی کے جوہر دکھانے کی دعوت دیتیں۔ تب خواتین طاقتور ہوا کرتی

تھیں۔ 12 ہزار سال قبل مسیح کے معاشروں کا جائزہ لیں تو ہمیں خواتین شکار کرتی نظر آتی ہیں، حتیٰ کہ 7 اور 8 ہزار سال قبل مسیح بھی خواتین زرعی معاشروں کی بنیاد رکھنے میں صفِ اول میں نظر آتی ہیں۔ خواتین کے لئے اصل مسائل صنعتی انقلاب نے برپا کیے، نئی ٹیکنالوجی نے خواتین کو مردوں کے پیچھے دھکیل دیا اور یوں عورت کے جسم کی مرد کے جسم سے مختلف ساخت کو بنیاد بنا کر اُسے 'معاشی، معاشرتی اور سیاسی' سطح پر بھی شاعرانہ انداز میں 'نرم و نازک' کے ریشمی لباس میں لپیٹ کر ترقی کی رفتار میں بہت پیچھے دھکیل دیا گیا۔ کئی آوازیں جو دنیا کی دونوں اطراف سے بلند ہوئیں انھوں نے حقوقِ نسواں کو کلی طور پر سماجی و معاشرتی تصور قرار دیا۔ یہ بات اس لئے بھی درست معلوم ہوتی ہے کہ حقوق تو اُن خواتین کو بھی میسر ہیں جو کسی بھی مذہب یا عقیدے کی پیروکار نہیں جس کی سب سے بڑی مثال روس اور چین ہیں۔ اگرچہ روس میں ایک کثیر تعداد عیسائی مذہب کے ماننے والوں کی ہے مگر معاشرہ کلی طور پر کسی مذہب کا پروکار نہیں۔ چین بجا طور پر ایسا ملک ہے جو کسی مذہبی عقیدے کو نہیں مانتا بلکہ واحد چینی صوبہ سنکیانگ میں مسلمانوں کی حالتِ زار سبھی کے سامنے ہے۔ اگر حقوقِ نسواں کو مذہب یا عقیدے کی عینک سے دیکھا جائے

اسلام نے خواتین کے لئے بے پناہ اور انتہائی شائستہ حقوق متعین کیے ہیں۔ اگرچہ قرآن میں کئی جگہوں پر خواتین کے حقوق کی بات کی گئی ہے مگر بہت ہی جامع اور منظم انداز میں سورۃ البقرہ، سورۃ النساء اور سورۃ النور میں تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ سورۃ النساء میں تو عورت کو مرد (آدم) سے پیدا ہونے کی بات کی گئی اور پھر آگے جا کر قرآن میں آدم کو کہا گیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں آرام سے رہو، مکمل آزادی کے ساتھ کھاؤ پیو، گھومو پھرو، خوش رہو مگر خبردار اُس درخت کے قریب مت جانا اور اگر تم نے ایسا کیا تو تم خطاواروں میں سے ہوگے۔ اگرچہ کئی جگہوں پر مثلاً مندرجہ بالا سورتوں اور احادیث کی تاحال مستند کتابوں بشمول بخاری شریف میں بھی خواتین کے حقوق کی عمدہ بات کی گئی ہے۔ اسلام میں مرد پر عورت کا ہر معاشرتی مقام واضح کر دیا گیا ہے اور زور دیا گیا ہے کہ مرد پر لازم ہے کہ عورت کا احترام کرے اور حقوق کا خیال رکھے۔ اگر عورت ماں ہے تو کہا گیا ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے یعنی بیٹوں پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ عورت (ماں) کی مکمل فرمانبرداری کریں۔ واضح رہے یہاں مرد کو عورت سے آزادی نہیں دی گئی، جسے نافرمانی کہا جائے یا کوئی اور لفظ دیا جائے مگر یہاں عورت کے

ماں والے روپ میں مرد چاہے وہ ایک ہو یا دس بیس ہوں سب پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی تابع داری کریں گے تب جا کر (مذہبی طور پر) جنت حاصل کر پائیں گے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں کائنات کے خالق نے مرد کیلئے جنت کا حصول عورت کی تابع داری سے مشروط کر دیا ہے۔ مذہبی طور پر مرد چاہ کر بھی اس تابعداری سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اگر زمینی طور پر ایسا کوئی قانون بنایا جائے تو وہ غیر اسلامی ہوگا۔ دوسرا پہلو بیوی کا ہے۔ عورت جب بیوی کے روپ میں کسی مسلمان مرد کی منکوحہ ہوتی ہے تو مذہب کہتا ہے اب وہ عورت آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ نے اُس عورت کی تمام تر معاشی و معاشرتی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے اور ایسا کرنا واجب ہے۔ یہاں بھی مرد راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اسلام نے مرد کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی عورت (بیوی) کی تمام تر معاشی و معاشرتی ضروریات کا خیال رکھے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ ایسا کرنا مرد نے اپنی غیرت مان لیا ہے جو احترام کی اگلی شکل ہے یعنی مرد یہ گوارہ ہی نہیں کرتا کہ اُس کی عورت (بیوی) کہیں جا کر نوکری کرے یا اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے خود محنت کرے۔ عورت کا تیسرا پہلو بیٹی کا ہے۔ مذہبی حوالے سے جب بیٹی کسی گھر میں آتی ہے تو خالقِ کائنات نے اُسے رحمت قرار دیا ہے۔ کئی مستند احادیث ہیں جن میں نبی پاکؐ نے واضح فرمایا ہے کہ جب ایک مسلمان اپنی بیٹی کی اچھی پرورش کر کے، تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے، اچھی جگہ اُس کا رشتہ (شادی) کرتا ہے اور وہ تمام حقوق اُسے دیتا ہے مثلاً جائیداد کا حق بیٹی کو دیتا ہے تو وہ شخص اُس دن جنتی ہو جاتا ہے۔ اب یہ تصور کسی اور مذہبی یا معاشرتی حوالے سے ہمیں کسی معاشرے میں نہیں ملتا۔ بلکہ ایک حدیث اس قدر حالات کو بیان کرتی ہے کہ جس مسلمان کی دو بیٹیاں ہونگی اور وہ دونوں کو بیاہ دیگا تو وہ روزِ قیامت میرے (آپؐ) کے ہمراہ یوں کھڑا ہوگا جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں برابر ہوتی ہیں۔ عورت کا چوتھا روپ بہن کا ہے کہ جب آپ کی بہن پیدا ہوتی ہے تو اُس کا خیال کرنا بطور بھائی آپ پر فرض ہے، اُس کی معاشی ضروریات سے لے کر سماجی میل جول اور حُرمت کی حفاظت تک بھائی پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ مذہبی طور پر عورت کے حقوق اور تقدس کا تحفظ شاید نہ ہی کسی اور مذہب سوائے اسلام اور نہ ہی کسی اور معاشرہ میں ملتا ہے۔ دیگر ممالک اور معاشروں کے رائج قوانین اور نظاموں کا جائزہ لیں تو ہمیں مغربی ممالک میں ایک جھلک نظر آتی ہے جہاں عورت کو حقوق عملی طور پر میسر ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس،

جرمنی اور دیگر یورپی ممالک میں عورت کو ہر قسم کے حقوق میسر ہیں۔ اگرچہ یہی وہ معاشرے ہیں جہاں پہلے عورت کو معاشرہ کی نصف آبادی تک تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اور جیسا کہ اوپر بحث کی گئی ہے کہ عورت کو 1920 تک امریکہ جیسے ملک میں ووٹ کا حق تک حاصل نہ تھا۔ جبر کی اِفضا میں عورت جب گھروں سے باہر نکلی تو اُس نے ترتیب سے تمام حقوق مانگے جو اُس کا حق تھا یا جن کو وہ اپنا حقوق سمجھتی تھی۔ نتیجے کے طور پر اب عورت مغربی معاشروں کو مرد کے بالکل برابر کی فرد مانی جاتی ہے۔ مگر عورت کے اس معاشرتی کردار کو زیرِ بحث لانے سے قبل مغربی عورت کے متعلق مشرقی معاشروں میں رائج ایک غلط العام وہم کا خلاصہ کرنا ضروری ہے۔ مشرقی معاشروں میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ مغربی عورت کو ہر قسم کے حقوق میسر ہیں، وہ مرد کے برابر ہے، اُسے کوئی ہاتھ تک نہیں لگا سکتا، اُسے مکمل آزادی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ہم ہالی وڈ کی فلموں کو دیکھیں تو بعض اوقات عورت کو مرد کے معاشرتی کردار سے بھی زیادہ اہم دکھایا گیا ہے اور اُسے مرد سے زیادہ ذہین اور لیڈرشپ کردار کی حامل خاتون کے طور پر بھی دکھایا گیا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ مغرب کی ہالی وڈ فلموں کے ذریعے مغربی معاشروں میں عورت کے کردار کو نہیں پرکھا جا سکتا بلکہ وہاں کی اصل صورتحال کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ اس بحث کا اصل مقصد ہی اُس نظام کا اجرا کرنا یا کم از کم پرچار کرنا ہے جو عورت کی فلاح و بہبود کی بات کرتا ہے یا جس میں عورت کی فلاح پنہاں ہے۔

درحقیقت مغربی معاشروں میں عورت کو پیدا ہونے، بچہ پیدا کرنے، جنسی تعلقات رکھنے، جائز (شادی کے بعد) اور ناجائز (کسی مرد سے شادی کیے بنا) بچہ پیدا کرنے کی اِجازت اور اس عمل کا تحفظ میسر ہے۔ عورت کو وہاں ایک خاص عمر تک پہنچنے کے بعد اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کی اجازت ہے، ساتھ ہی اُسے خود کمانے کی اجازت ہے وہ اپنی زندگی کا مالکِ کل ہے، چاہے تو وہ شادی کر کے کسی مرد کے ساتھ زندگی گزارے یا چاہے بنا شادی کیے کئی مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرے، مغربی معاشرہ اُسے مکمل تحفظ دیتا ہے، اس صورتحال میں نہ ہی تو والدین کچھ عمل دخل کر سکتے ہیں، اُسے روک ٹوک نہیں سکتے اور نہ ہی اُس کی سرزنش کر سکتے ہیں۔ اس لیے مغربی معاشروں میں بڑے بچوں کو اکثر اوقات اپنے والدین کے ساتھ رہنے کیلئے بھی گھر کا کرایہ دینا پڑتا ہے۔ یہ بات میں نے خود کئی دوستوں سے تصدیق کے بعد لکھی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے اور کئی کیسز بھی رپورٹ

ہوئے ہیں کہ مغربی معاشروں میں بہن بھائیوں، باپ بیٹی، ماں بیٹا اور دیگر قریبی رشتوں کے درمیان بھی جنسی تعلقات قائم ہیں اور مغربی معاشرہ کو ان اعمال پہ اعتراض نہیں۔ بلکہ مغربی معاشرہ کی اجازت یا اسے آزادی اظہار زندگی کہہ لیں یا زندگی گزارنے میں مکمل آزادی کہہ لیں تمام کو اپنے مطابق زندگی گزارنے کی مکمل اجازت اور ایسا کرنے کا تحفظ بھی حاصل ہے۔ اب یہاں تھوڑا سا رُکیے۔ مغرب میں جب عورت کی تربیت اس انداز میں کی جاتی ہو کہ اُسے بچپن سے لے کر جوانی تک اگر والدین اچھے اور بُرے سمجھانے کے متعلق آگاہی دینا چاہے اور اگر بچہ وہ نہ سننا چاہے تو وہ اس عمل پہ بھی والد کو سزا دلوا سکتا ہے، اگر والد اپنے بچے کے روشن مستقبل کیلئے اُسے ہلکی سی سزا دے دے اور بچہ اُس عمل کو پولیس سٹیشن رپورٹ کر دے تو بھی والد کو سزا دی جائے گی۔ جب وہ لڑکی بڑی ہوتی ہے تو اُسے معلوم ہے کہ وہ جس سے بھی جنسی یا سماجی تعلقات رکھے اُسے والدین سمیت کوئی فرد بھی نہیں روک ٹوک سکتا تو انفرادی اور سماجی فلاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ مغرب میں آج شاید ایک عورت بھی ایسی نہیں ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ کسی مرد سے شادی سے پہلے تک اُس کے کسی اور مرد یا اور مردوں کے ساتھ جنسی تعلقات نہیں تھے، اگرچہ مرد بھی ایسا دعویٰ نہیں کر سکتے مگر چونکہ یہاں زیرِ بحث عورت ہے تو ہم فی الحال عورت کی بات کریں گے۔ مغرب میں عورت کو خود کمانا پڑتا ہے، خود گھر کے متعلق سوچنا پڑتا ہے، خود رہنا اور خود زندگی گزارنے بارے فیصلہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے اُس کی کل سماجی زندگی محض چند سال بچپنے کے ہوتے ہیں وگرنہ وہ مکمل آزادی کے ساتھ مکمل ذمہ دار بھی ہوتی ہے اپنے ہر عمل کی اور اپنے مکمل مستقبل کی۔ اس لیے مغربی معاشروں میں شادی کی رسم تک محض دو افراد تک محدود ہوگئی ہے، کوئی تقریب، کھانا یا میل جول نہیں ہوتا، مغرب میں شادی محض چند منٹ کا معاہدہ ہوتا ہے جو پہلے چرچ اور اب شاید عدالتوں اور وکلا کے کمرے تک محدود ہوگیا ہے۔ شادی کے ٹھیک اگلے دن وہ خود کمانے کی ذمہ داری ہوتی ہے، اگر مرد چاہے بھی تو بھی عورت ایسا اس لیے نہیں کرتی کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اُس کی آزادی ختم ہو جائے گی، اس لیے وہ خود گھومنا پھرنا چاہتی ہے۔ بھائی، والد، بہنوں کا کردار بھی محض کسی تقریب میں ملاقات تک محدود ہوگیا ہے۔ دراصل عورت کی آزادی نے مغرب میں عورت سے وہ حقوق ہی چھین لیے ہیں جو عورت کو مشرقی معاشرے دیتے ہیں۔ اب ذرا مشرقی معاشروں میں عورت

کے سماجی کردار پر نظر دوڑائیے۔ بھارت میں عورت کو دیوی مانا جاتا ہے، دیوی اس عظیم عورت کو کہا جاتا ہے جس کی پوجا کی جاتی ہو اور ہندو دھرم میں کالی ماتا اور کئی دیویوں کا تصور بھی اس لئے موجود ہے کہ عورت ایک مقدس مخلوق ہے جس کی پوجا کرنا ہر مرد پہ لازم ہے۔ اور مشرقی معاشروں میں مرد کو اس قدر عظیم مانا جاتا ہے کہ باقاعدہ ایک 'ستی' کی رسم تھی جس میں عورت کو اپنے مرنے والے شوہر کے ساتھ زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ کہتے ہیں اس رسم کا آغاز شوہر سے وفاداری سے شروع ہوا کہ مرد ہی اس کی دنیا اور دیتا ہے اگر مرد نہیں رہا تو عورت کا اس دنیا میں رہنا فضول اور اضافی ہے اس لیے عورت خود ستی ہونا چاہتی تھی مگر بعد ازاں معاشرہ نے یہ تجزیہ کیا کہ عورت کے ستی ہو جانے کے بعد اس خاندان کے بچوں کی کفالت ایک بڑا مسئلہ ہے۔ جب اس موضوع پہ بحث شروع ہوئی تو ستی کی رسم مذہبی رسم بن چکی تھی اور عورت کو زبردستی ستی کر دیا جانا شروع ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ شروع میں تیسرے مغل بادشاہ جلالدین محمد اکبر نے اس رسم کو ختم کرنا شروع کیا مگر بعد ازاں وہ خود ہندو دھرم کے ساتھ گھل مل گیا یوں ستی کی رسم جزوی طور پر ختم ہو گئی مگر کچھ علاقوں میں جاری رہی۔ بعد ازاں یہ رسم کچھ مسلمان علما کی تحریکوں، کچھ ہندو زعما اور بعد میں ہندی قوانین کے بعد باقاعدہ طور پر ختم ہو گئی۔ اسی طرح اگر ہم بالی وڈ کی فلموں کا جائزہ لیں تو عورت کا کردار ہماری دیوداس اور دیگر کئی ایسی فلموں میں نظر آتا ہے جس میں عورت کو محبت کی علامت مانا گیا ہے جو ہر وقت اپنے شوہر کا انتظار کرتی ہے، وہ ہر پل اپنے شوہر کے خواب دیکھتی ہے، شادی سے پہلے اپنے لیے شہزادے کا تصور لے کر جیتی ہے اور شادی کے بعد اپنے شوہر سے محبت کا دم بھرتی نظر آتی ہے۔ اس دوران وہ بچے بھی پیدا کرتی ہے، ان کی پرورش بھی کرتی ہے، اگر بچی ہو تو پیدا ہوتے ہی وہ اُس کی تربیت اس انداز میں کرنا شروع کرتی ہے کہ اُس بچی نے بڑے ہو کر پرائے (اپنے سسرال) گھر جانا ہے اور وہاں وہ اپنے میکہ (دھیاں) کی عزت ہو گی اس لیے اُسے گھر کے تمام امور پر دسترس حاصل ہونا ضروری ہے، اُسے ادب و آداب آنے چاہیں تاکہ وہ اچھے انداز میں اپنے سسرال زندگی بسر کرے، اُسے شائستگی سے پیش آنا چاہیے، رشتے نبھانے آنے چاہیں، یہ تمام باتیں ایک والدہ اپنی بیٹی کو سکھاتی ہے، تدریس سے لے کر شادی تک اُسے اگلے گھر جانے کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بیٹوں کو گھر چلانے اور اپنے باپ کا نام آگے لے جانے کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔ شادی کے

بعد وہ لڑکی خود کو گھر کی وارث تو سمجھتی ہے مگر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ ساس اُس کی دوسری ماں ہے اس لیے گھر کی مالکہ ماں یا ساس کو سمجھا جاتا ہے، اچھے گھروں میں ساس اپنی بہو کو اپنی بیٹی کا درجہ دیتی ہے۔ اگرچہ مشرقی معاشروں میں ساس بہو کے جھگڑے بارے بہت کچھ لکھا گیا اور فلمایا گیا ہے جو بہت حد تک سچ بھی ہے مگر ایک مکمل گھر کا منظر مشرقی معاشروں میں ساس اور بہو کے ساتھ رہنے سے ہی مکمل ہوتا ہے۔ اسی طرح مشرقی معاشروں میں مرد اپنی شان سمجھتا ہے کہ وہ اپنی عورت کیلئے کمائے جائے اور اُس کے ناز نخرے اٹھائے۔ مشرقی معاشروں میں چاہے وہ ہندی معاشرہ ہو یا مسلم معاشرہ دونوں میں شادی سے قبل عورت کے کسی مرد کے جنسی تعلقات کو نہ صرف ناجائز سمجھا جاتا ہے بلکہ نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور خود عورت بھی کسی مرد سے تعلقات رکھنے کو اپنے لئے نفرت انگیز سمجھتی ہے۔ بلکہ اگر ایسا ہو جائے تو شادی کے بعد مرد اس چیز کو بُرا سمجھتا ہے کہ اُس کی عورت نے دھوکے سے کسی غیر مرد سے جنسی تعلقات قائم رکھے ہوئے تھے۔ مشرقی مذہبی معاشروں میں یہ روایت عقیدے کا جزو لازم ہے کہ اگر عورت کی وفات ہو جائے تو غیر مرد کیا خود اُس عورت کا شوہر تک اُس کے وجود کو ہاتھ نہیں لگا سکتا بلکہ اُس وفات پانے والی خاتون کے جسدِ خاکی کو صرف خواتین ہی ہاتھ لگا سکتی ہیں۔ یہاں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورت کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ اگر مشرقی اور مغربی معاشروں کا موازنہ کیا جائے تو بلاشبہ ہم یہ کہنے پہ مجبور ہیں کہ عورت کی حُرمت اور تقدس کا جو تصور مشرقی معاشروں میں ہے مغربی معاشرہ ابھی تک اُسے چھو کر بھی نہیں گزرا۔ اگر ہم تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مغربی نعروں کے برعکس مشرقی معاشروں میں خواتین کی حالت بہت مختلف ہے۔ اگرچہ مغربی ہرکاروں نے بہت کوشش کی ہے کہ مشرقی معاشروں کو بگاڑا جائے اور بہت کچھ بُرا بنا کر دکھانے کی بھی کوشش کی ہے اور وہ اس کوشش میں بہت حد تک اس لیے کامیاب ہوئے ہیں کہ مشرقی معاشروں میں خواتین کو تعلیم کے میدان میں کافی مشکلات درپیش ہیں۔ حالانکہ مشرقی معاشروں میں خواتین کی قائدانہ صلاحیتوں اور سیاسی مقام کا تعین دونوں معاشروں کے تقابلی جائزہ سے لیا جا سکتا ہے۔ مغربی معاشروں میں ہمیں محض چند خواتین بشمول مارگریٹ تھیچر، انجیلا مرکل منظر نامے پہ نظر آتی ہیں۔ مغربی معاشرہ کا چیمپین خود امریکہ اس قدر تعصب کا شکار ہے کہ آج تک امریکہ میں خاتون کو کرسی صدارت پہ

نہیں بیٹھنے دیا گیا بلکہ کچھ حوالا جات ایسے بھی ملتے ہیں کہ گزشتہ الیکشن میں ہیلری کلنٹن کی جیت یقینی تھی مگر امریکی انٹیلی جنس اداروں نے 'عورت' کی حکمرانی پہ مرد کو ترجیح دی اور ڈونلڈ ٹرمپ کو کرسی پہ بٹھایا گیا۔ جب دوسری جانب اگر دیکھا جائے تو پاکستان نے دو بار وزارتِ عظمیٰ کی کرسی ایک خاتون شہید محترمہ بے نظیر بھٹو کو دی، ایک عورت ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کا سپیکر قومی اسمبلی بنایا گیا، ایک خاتون کو حال ہی میں ایوانِ بالا میں اپوزیشن لیڈر چنا گیا ہے، ایک خاتون ڈاکٹر شہلا رضا کو صوبائی اسمبلی سندھ کا سپیکر بنایا گیا، ایک ہندو خاتون سینیٹر مینا کماری کو علامتی طور پر ایوانِ بالا کا چیئرپرسن منتخب کرایا گیا جو سندھ صوبہ میں ایک ہاری کی بیٹی ہے، پاکستان کے سب سے بڑے صوبہ پنجاب کی ایڈیشنل چیف سیکرٹری ایک خاتون مسز ارم بخاری ہیں جنہوں نے بطور سیکرٹری ویمن ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ کے 'میرا جسم میری مرضی' کے نعرے کو اس لیے مسترد کر دیا کیونکہ اس میں مشرقی معاشرے کی حقیقت نہیں بلکہ گمراہی پنہاں تھی۔ مسز ارم بخاری کا ماننا ہے کہ مشرقی معاشروں میں خواتین کو مکمل آزادی حاصل ہے وہ تعلیم اور اعلیٰ کردار کے بل بوتے پر بڑے سے بڑے عہدے پر براجمان ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح بھارت میں ایک خاتون پرتیبھا پٹیل کو بھارت کا صدر منتخب کیا گیا، دو بار ایک خاتون اندرا گاندھی کو وزارتِ عظمیٰ کی کرسی سونپی گئی۔ بنگلہ دیش میں کئی سالوں سے دو خواتین حکمرانی کر رہی ہیں۔ جن میں ایک بانی بنگلہ دیش شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی بیگم حسینہ واجد اور دوسری بیگم خالدہ ضیا ہیں۔ مگر حیران کن حد تک دیکھا جائے تو مغربی معاشرہ مشرقی معاشروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور یہاں کہ کم پڑھی لکھی خواتین کو اپنی طرف مائل کرنے کیلئے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مشرقی معاشرے میں عورت کو طے شدہ حقوق کی فراہمی میں دشواریاں ہیں اور وہ اپنے جائز حقوق کے حصول کیلئے باہر نکلتی ہے اور اُسے ایسا کرنا بھی چاہیے مگر مشرقی معاشروں میں عورت کو اپنے حقوق کا خود جائزہ لینا ہوگا اس مقصد کیلئے مشرقی معاشروں کو اپنے رسم و رواج، مذہب، ثقافت، سائنس اور دیگر علوم کی تعلیم کا مناسب اور دیرپا بندوبست کرنا چاہیے تاکہ عورت صحیح معنوں میں معاشرے کا اہم رُکن ثابت ہو اور معاشرتی و ملکی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکے۔ مغربی معاشرے میں عورت کو حقوق کے نام پر وہ آزادی دی گئی ہے جس سے معاشرتی بگاڑ پیدا ہوا ہے، پورا معاشرتی ڈھانچہ ہل کر رہ گیا ہے، مغربی معاشرہ میں اس آزادی نے کم سن بچیوں کو بنا شادی کیے حاملہ بنا دیا ہے

جس سے نہ صرف والدین پریشان ہیں بلکہ خود معاشرتی نظام بگڑ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی معاشروں کے وہ خاندان جو مغرب کی چکا چوند روشنیوں کو دیکھ کر وہاں آباد ہوئے وہ اپنی اولادوں کی شادیاں مشرقی معاشروں میں کرنے کو ترستے ہیں، وہ مغرب کے نظام سے اوائلِ عمری میں تو پسند کرتے تھے مگر جب اپنے بچے جوان ہوئے تو وہ مغربی معاشرے سے نالاں نظر آتے ہیں۔ اس موضوع پر بالی وڈ، لالی وڈ اور دیگر ممالک کی فلمی صنعت نے کئی فلمیں بنائی ہیں مگر نتائج اس لیے نہیں مل رہے کیونکہ وہ اب مغربی معاشرے میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ مغربی معاشرے نے جب مشرقی معاشرے کو اپنی روشنیوں کی طرف مائل کیا تو بہت سے ایسے قباحتیں بھی شامل ہو گئیں جن سے مشرقی معاشرہ ہچکولے کھا رہا ہے۔ مشرقی معاشروں کی خواتین کی محدود تعداد مگر تمام تر سہولیات سے بہرہ ور خواتین مغربی کلچر سے متاثر ہو کر مشرقی معاشرے میں خواتین کے حقوق کے نام پر کچھ ایسا کر رہی ہیں جس سے مشرقی معاشرہ گھٹن کا شکار ہو رہا ہے۔ حالانکہ سمجھنا چاہیے تھا کہ مغربی معاشرے کی اقدار، روایات اور تمدن مشرقی معاشرے کی ثقافت، روایات، اقدار اور تمدن سے کافی مختلف ہے مگر محدود خواتین کی تعداد جنہیں پاکستان کے معاشرے میں قریباً ہر طبقہ چاہے وہ مذہب کا ہو، سیاست، تعلیم یا چاہے ثقافتی طبقہ ہو سب ٹھکراتے ہیں۔ حال ہی میں چند پاکستانی خواتین نے ''خواتین ڈے'' کے نام پر ایسا ڈھونگ رچایا جس نے مشرقی معاشرے کی جڑیں ہلانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان خواتین نے عورتوں کے حقوق کا پرچار جیسا نعرہ لگایا مگر ریلیوں میں لوگوں نے ایسے ایسے بینرز اور پلے کارڈز دیکھے جن نعروں کا تعلق دور دور تک پاکستانی معاشرے سے نہیں تھا۔ مثلاً کچھ خواتین نے پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے۔ 'میرا جسم، میری مرضی'۔ 'اینڈ آف سٹوری -- مردانہ کمزوری'۔ 'کھانا خود گرم کرو'۔ 'اپنا بستر خود گرم کرو'۔ 'مجھے کیا معلوم تمہارا جوتا کہاں پڑا ہے'۔ ان تمام نعروں پر پاکستان میں بڑی بحث ہوئی ہے۔ بلکہ ایک معروف پاکستانی ڈرامہ مصنف خلیل الرحمٰن اور مغربی معاشرے کی متنازعہ رسومات کے زیرِ اثر ماروی سرمد نے ایک ٹیلی ویژن پروگرام میں باقاعدہ ایک دوسرے کو گالیاں دے ڈالیں۔ دونوں کے گالم گلوچ نے پاکستانی الیکٹرانک میڈیا باقاعدہ جنگ کی سی کیفیت پیدا کر دی، دھڑے بندی اس قدر شدت اختیار کر گئی کہ سال 2020 کے 'عورت مارچ' کو خلیل الرحمٰن کے کردار اور اُن کی رائے کے طور پر منایا گیا۔ پاکستان میں 'عورت ڈے' کے

دن مختلف اقسام کے 'عورت مارچ' دیکھنے میں آئے۔ وہ خواتین جو خود کو لبرل لوگوں کا ہم خیال سمجھتی ہیں انہوں نے 'عورت مارچ' میں ایسے بینرز اٹھا رکھے تھے جن پر ایسے نعرے چسپاں تھے جنہیں نہ صرف مرد طبقہ نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا بلکہ خود خواتین کی ایک بڑی تعداد جن کا تعلق مختلف اسلامی جماعتوں، مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس تعلق تھا انھوں نے بھی عورت مارچ کو ناپسند کیا۔ اُن کے مطابق یہ خود عورت کے وقار کے خلاف ہے کہ وہ اپنے جسم کی نمائش کرتی پھرے۔ 'عورت ہیرے کی مانند ہے اور ہیرا ہمیشہ محفوظ رہتا ہے'۔ 'ہر قیمتی چیز کو ہمیشہ لپیٹ کر رکھا جاتا ہے'۔ کچھ ایسے نعرے بھی مذہبی رجحان رکھنے والی خواتین نے 'عورت مارچ' کے مقابل ریلیوں میں پلے کارڈز کی صورت میں اُٹھا رکھے تھے۔ ایک طرف لبرل اور دوسری طرف مذہبی رجحان رکھنے والی خواتین نے اپنے اپنے انداز میں 'عورت مارچ' نکالے اور دونوں نے اپنے مزاج اور سوچ کے مطابق عورت کی آزادی کو نمایاں کیا ہوا تھا۔ تیسری طاقت بڑی طاقتور تھی۔ تیسری 'عورت مارچ' ان خواتین نے نکالا جو حکومت کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ یعنی یہ وہ خواتین تھیں جو حکومتِ پاکستان کے مختلف محکمہ جات سے تعلق رکھتی تھیں اور کسی نہ کسی صورت میں حکومت سے وابستہ تھیں۔ انھوں نے دونوں یعنی لبرل اور مذہبی رجحان رکھنے والی خواتین کی سوچ کو بہت حد تک مسترد کرتے ہوئے عورت کے 'طاقتور' ہونے کے پہلو کو اُجاگر کیا یعنی ان خواتین نے ملک وقوم کو بتایا کہ پاکستان میں عورت کو مذہب کے ساتھ ساتھ سیاسی حقوق بھی میسر ہیں۔ پاکستان کی عورت ایک طاقتور عورت ہے جو اپنی محنت کے بل بوتے پر کسی بھی عہدے پر پہنچ سکتی ہیں اور اپنے خاندان، ملک وقوم کی نہ صرف خدمت کر سکتی ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر مردوں کے ٹولے کی نمائندگی بھر کر سکتی ہے۔ ایڈیشنل چیف سیکرٹری انرجی پنجاب مسز ارم بخاری نے پاکستان میں خواتین کی معاشی، معاشرتی اور سماجی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور میڈیا کے سامنے خواتین کی بڑی تعداد کو بتایا کہ پاکستان میں خواتین نہ صرف مکمل طور پر آزاد ہیں بلکہ انہیں ہر قسم کے حقوق میسر ہیں۔ دورانِ گفتگو خود مسز ارم بخاری نے بتایا کہ ان کا تعلق صوبہ پنجاب کے ایک ایسے ضلع سے ہے جہاں خواتین کو سماجی و معاشرتی لحاظ سے آگے نہیں بڑھنے دیا جاتا، یہ ایک عام تصور ہے مگر وہ نہ صرف آگے آئیں بلکہ اب پاکستان کی پہلی خاتون ایڈیشنل چیف سیکرٹری ہیں۔ انھوں نے کئی قومی اور بین الاقوامی وفود کی سربراہی کی جن میں کثیر تعداد میں مرد حضرات ان کی

نمائندگی میں وفود میں شامل تھے۔ جینڈر سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی کی چیئرپرسن پروفیسر رعنا ملک بھی خواتین طلبہ کی کثیر تعداد میں مذکورہ سیمینار میں شریک تھیں۔ ان تاریخی حوالوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو بلاشبہ اس دلیل کو مانا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں خواتین کو حقوق میسر ہیں، کم از کم پاکستان میں خواتین کو معاشرتی و سماجی سطح پر اس قدر ضرور قبول کیا جاتا ہے جتنا آج تک امریکہ میں نہیں کیا گیا وگرنہ وہاں آج ڈونلڈ ٹرمپ کے مقابلے میں ہیلری کلنٹن ملک کی کرسیِ صدارت پر براجمان ہوتیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ ابھی پاکستان میں اسلام، آئین و قانون کے مطابق طے شدہ حقوق کی فراہمی کئی ایک مشکلات کا شکار ضرور ہے مگر حالات اس قدر بالکل بھی نہیں جس انداز میں مغربی میڈیا خواتین کی خود ساختہ حالاتِ زار دکھاتا ہے یا دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مشرقی خواتین آج بھی اپنی عزت و حرمت کو مغربی معاشروں کی خواتین سے کئی گنا زیادہ اچھا سمجھتی ہیں کیونکہ مشرقی معاشروں میں آج بھی مرد اپنی خواتین کو اپنی عزت ہی سمجھتا ہے اور ان کی خدمت کو اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہے۔ من جملہ گفتگو کا اگر خلاصہ کیا جائے تو بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ خواتین کا کلی کردار تو اب دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا جو ہمیں رومی تہذیب سے کئی سو سال پہلے نظر آتا تھا جب خواتین قبائل کی سربراہ ہوا کرتی تھیں اور مرد امورِ خانہ داری میں مصروفِ عمل رہتا تھا مگر آج بھی خواتین نے خود کو مردوں کے مقابلے میں منظم انداز میں منوایا ہے، جیسے پاکستان میں شہید محترمہ بے نظیر بھٹو، جرمنی میں انجیلا مرکل، برطانیہ میں مارگریٹ تھیچر اور تھریسا مے، بھارت میں اندرا گاندھی اور ان کی بہو سونیا گاندھی، نیوزی لینڈ میں جیسینڈرا، آسٹریلیا میں جولیا گیلارڈ، بنگلہ دیش میں بیگم حسینہ واجد اور بیگم خالدہ ضیا اور دیگر کئی ایک ممالک میں خواتین کی محدود مگر قابلِ ذکر تعداد نے دنیا بھر میں اپنا سکہ منوایا ہے اور یہ تناسب بڑھتا جارہا ہے، امید کی جاسکتی ہے کہ جب خواتین نہ صرف مردوں کے برابر بلکہ ان سے کہیں زیادہ اچھے انداز میں معاشرتی، سیاسی، ثقافتی اور مذہبی انداز میں کردار ادا کرتی نظر آئیں گے، یہ ضرور ہے کہ مغربی معاشروں کو مشرقی معاشروں سے خواتین کی عزت و حرمت بارے ضرور سیکھنا چاہیے اور بالکل اسی طرح مشرقی معاشروں کو مغربی معاشروں سے خواتین کی ترقی کی راہ میں حائل مشکلات کو دور کرنے کے متعلق سیکھنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

قائم نقوی ایک مطمئن شخص

قائم نقوی کا پورا نام سید قاسم حسین نقوی تھا، وہ مجھ سے عمر میں تقریباً دس سال بڑے تھے۔ میں اب چونسٹھ کا ہوں تو یقیناً قائم نقوی صاحب 74 سال کے ہوں گے۔ ہماری دوستی کا باقاعدہ آغاز 80 کی دہائی میں ہوا۔ یوں تو قائم نقوی مجھے مختلف حوالوں سے جانتے تھے۔ قائم نقوی صاحب کے والد گرامی ممتاز عالم دین قبلہ کعبہ مولانا منظور حسین نقوی میرے والد کے دوست تھے قبلہ مولانا سید ابوالحسن نقوی، قائم نقوی صاحب کے بھائی میرے چچا کے دوست تھے۔ پھر خود قائم نقوی صاحب میرے والد اور چچا کے دوست تھے، ان حوالوں سے دیکھیں تو ان سے میرا گہرا اور قریبی تعلق تھا پھر رسالہ فنون اور 'ماہِ نو' کے دفتر میں مسلسل ملاقات نے مجھے قائم نقوی صاحب سے باقاعدہ وابستہ کر دیا، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ قائم نقوی ایک شاعر ادیب اور ایک مدیر کی حیثیت سے کیا مقام و مرتبہ رکھتے ہیں، قائم صاحب کے مجموعہ کلام زادِ ہجر کی تقریب رونمائی پر میں نے ایک خاکہ پڑھا تھا، نام تھا۔ ''ماہِ نو کی میم'' اس خاکے میں کچھ فقرے یوں تھے، کہ قائم نقوی موٹر سائیکل پر جا رہے ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے فی میل ارجنٹ سروس کا نمائندہ ہو، دور سے دیکھو تو کلین اینڈ کلیئر کریم کا اشتہار نظر آتا ہے، خاموش ہو تو اجنبی لگتا ہے، بولے تو دوست اور دوست بھی ایسا کہ آپ کو لگے کہ آپ کے لیے دنیا آسان ہو گئی۔ آپ کچھ بھی کہہ دیں، ان کا بس یہ کہنا ہاں ہاں، یار کم ہو جائے گا۔ اسلام آباد منسٹری آف لا اینڈ ریفرنس سے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے ڈاڑھی رکھ لی تھی، وہ سفید ڈاڑھی اور سفید بالوں میں کچھ اور خوبصورت لگتے تھے۔ وہ خود جتنے خوبصورت تھے، باطن میں اس سے زیادہ شفاف تھے، اپنے دوستوں کے لیے ایک مددگار اور دشمنوں کے لیے ایک سادہ شکار، اگرچہ میں نے ادبی دنیا

اعجاز رضوی

میں ان کا کوئی دشمن نہیں دیکھا، مگر 'ماہ نو' کے زمانے میں کہیں کہیں ایسا منظر نظر آتا ہے مگر قائم صاحب کی وہی دائمی مسکراہٹ، اور یہ کہنا کے یار چھڈ دیو، ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ دفتر میں آ کر ہمیشہ درخواست کرتے کہ چائے کے دو کپ لاؤ، درخواست اس لیے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بہت احترام سے بات کرتے تھے۔

جب دیکھنے والا پوچھتا کے قائم صاحب آپ اکیلے اور چائے دو کپ تو کہتے او یار، کوئی نہ کوئی تے آ ہی جائے گا، اور ہمیشہ یہ ہی ہوتا تھا، 'ماہ نو' کا دفتر صبح 9 بجے سے شام 5 بجے تک دا تا دربار بنا رہتا۔

وہ واقعی ایک ہمدرد اور مددگار شخص تھے، اور اسی خوبی نے ان کو ایک اطمینان بھی عطا کیا تھا، اسی اطمینان نے اُن سے موت کے خوف کو دور کر دیا تھا، یہ ہی وجہ تھی کہ جب انھیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تو انھوں نے کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا، نہ ہی احباب سے گلہ کیا کہ وہ ان سے ملنے کیوں نہیں آئے، بلکہ ان کا یہ کہنا کہ یار سب مصروف لوگ ہیں۔ اللہ انھیں خوش رکھے، قائم نقوی کو شاعر ثابت کرنے کا شوق نہیں تھا۔

اگرچہ وہ اُردو غزل اور نظم میں ایک منفرد پہچان رکھتے تھے۔ اُن کی شاعری ان کی شخصیت کی طرح سادہ مگر دل میں اُتر کر نئے جہاں آشکار کرتی ہے اور اُنھیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ قائم نقوی کی شاعری میں لفظوں کو سلیقے سے برتنے کا ہنر موجود ہے۔

موجودہ دور میں لکھی جانے والی غزل کی شکل و صورت ایک سی ہے، مگر قائم نقوی نے سادہ الفاظ اور طرزِ بیان سے خود کو مختلف کیا ہے۔ غزل، نظم، کافی کے علاوہ قائم نقوی کے تخلیق کردہ رثائی ادب میں بھی قطعات، سلام اور منقبت کا انداز اور بات کہنے کا ہنر اُن کو دیگر احباب سے جدا کرتا ہے۔

ان کے تین شعری مجموعے، بیلے رمزاں دے (پنجابی) زادِ ہجر اور نطق، شائع ہوئے اور رثائی ادب کا مجموعہ تیاری کے مرحلے میں تھا۔ 'زادِ ہجر' اگست 1987 کو شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ بیلے رمزاں دے ستمبر 1988 کو شائع ہوا۔ پھر 'نطق' جنوری 2009 میں منظرِ عام آیا۔ تینوں شعری مجموعے قائم صاحب کے لیے خوشی کا باعث بنے۔ انھوں نے کبھی فائدہ اٹھانے کی بات نہیں کی ان کے کچھ اشعار:

کہنے کو تو اس عہد کے معمار ہمی ہیں
ہر راہ مگر راہ کی دیوار ہمی ہیں

وہ جن کی چھتوں پر کوئی سورج نہیں کھلتا
اُن زرد مکانوں کے خریدار ہمی ہیں

بھید مجھ پر بھی کب کھلا میرا
کیا کوئی دے سکے پتا میرا

آنکھ کی لو میں ہے ضمیر کی لو
مجھ میں زندہ ہے رہنما میرا

جہاں ہم پاؤں دھرتے جا رہے ہیں
وہیں سے سب گزرتے جا رہے ہیں

لہو رنگ آسماں ہے سر پہ قائم
مگر لمحے گزرتے جا رہے ہیں

☆☆☆☆☆

لکھنؤ کا نوجوان شاعر

شاعرِ امروز

قمر عباس قمر

شاہد ماکلی

معنی کے نامعلوم دفینوں کی کرید قمر عباس قمر کو آگے سے آگے رواں رکھتی ہے۔ امکان کے غیر دریافت شدہ جزیروں کا کھوج انھیں نت نئے سفروں پر مائل رکھتا ہے۔ وہ سوانگ دھارے منظروں میں اترتے ہیں؛ منظروں کے اصل روپ سروپ تک رسائی پاتے ہیں اور آخر میں اپنی تپسیا کے نتائج اپنے قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری سے کی سنگلاخ ترائیوں میں اگنے والے سبزے کی طرح ہے جسے بارانِ گریہ کا تسلسل مزید گھنا کیے جاتا ہے۔ ان کی شاعری صبح کے دُودھیا سویرے جیسی ہے جس کی نظارت ایک طویل رین بسری کے بعد ہمارے من کی پھلواریوں میں آس اور مسرّت کے پھول مہکاتی ہے۔ ان کی غزل ہمیں مصحفی کے لہجے کی یاد دلاتی ہے —— وہ لہجہ جو کہ دلی کی گداز کر دینے والی داخلیت سے جُڑتا ہے اور پھر شعری روایت کے مرکزی دھارے کا حصہ بنتا ہے۔

قمر عباس قمر 12 مئی 1993 کو اترپردیش کے ضلع مئو میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی زبان میں ایم اے کیا۔ 2012 سے شعر گوئی آغاز کی۔ ذیل میں ان کا شعری انتخاب:

ہم اسیروں کو رہا ایسے کیا جاتا تھا
دیکھنے والوں کو ہم بھاگے ہوئے لگتے تھے

یوں تو ہر روز ہی جاتا ہوں میں دریا کی طرف
جانے کیا سوچ کے میں خود کو ڈبوتا نہیں ہوں

یہ دشت و جبل کچھ بھی نہیں ہیں مرے آگے
تم نے مری وحشت کا زمانہ نہیں دیکھا

یہ بلبلے کسی سوزِ نہاں سے اٹھتے ہیں
کوئی صدا تہِ آبِ رواں رکی ہوئی ہے

پلٹنے والے پرندوں پہ بد حواسی ہے
میں اس زمیں کا کہیں آخری شجر تو نہیں

دلوں کی بستیاں آباد بھی نہیں کرتا
یہاں کسی کو کوئی یاد بھی نہیں کرتا

میں گر پڑا تو کئی اور اٹھ کھڑے ہوں گے
وہ اس لیے مجھے برباد بھی نہیں کرتا

کوئی ہوا کے بہاؤ کو روک دیتا ہے
مری صداؤں کو آزاد بھی نہیں کرتا

اکیلا میں ہی نہیں ہجر کی سواری میں
کچھ اور لوگ بھی شامل ہیں شب گزاری میں

کئی تو مٹ گئے، کتنے کھنڈر بنے ہوئے ہیں
مکان اپنے مکینوں کی سوگواری میں

خواب دیکھے گئے اور خواب بھی ایسے کہ نہ پوچھ
آنکھیں شرمندہ ہوئی جاتی ہیں تعبیروں سے

مرے وجود کے اندر کا شور اتنا ہے
مجھے سنائی نہیں دیتی باہری آواز

مصور ہے تو اس کا ربط ہو گا
پہاڑوں سے، پرندوں سے، ندی سے

بہت کچھ بنتے بنتے رہ گیا تھا
مرے خوابوں میں، رنگوں کی کمی سے

دل کو یقین چاہیے، گردِ گماں نہیں
میں تجھ سے آگ مانگ رہا ہوں، دھواں نہیں

مجھے خبر نہیں، کیا چیز کھو رہا ہوں میں
بچھڑتے وقت مگر دوست! رو رہا ہوں میں

یہ کون وارِدِ دشتِ جنوں ہے، رنگ لیے
یہ کیا ہوا مجھے، تصویر ہو رہا ہوں میں

غرقاب ہو رہی ہے مری کشتیء حیات
دریائے نیستی سے اچھالے کوئی مجھے

میرے ماتھے پہ ابھر آتے تھے وحشت کے نقوش
میری مٹی کسی صحرا سے اٹھائی گئی تھی

تم آ رہے ہو تو پھر آمدِ بہاراں ہے
پرندے لوٹ رہے ہیں مرے مکاں کی طرف

☆☆☆☆☆

میں تھک گئی ہوں محبت پہ شاعری کر کے

شاعرِ امروز

زہرا قرار

شاہد ماکلی

زہرا قرار کی غزل کا سب سے نمایاں پہلو ان کے لہجے کی بے باکی ہے۔ ان کی غزل پڑھ کر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ مابعد جدید صورتِ حال سے دوچار نسوانی ذہن کی فکریات کیا ہیں؛ اور یہ کہ مابعد جدید مناظر سے جڑی ہوئی بصارت کے مشاہدات کیا ہیں؛ اور یہ کہ مابعد جدید مسائل کو جھیلنے والے دل کی کیفیات کیا ہیں؟ زہرا قرار کی غزل پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ بات اب حدیثِ دلبراں سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اب لاتعداد نئے مسائل ہیں جن کی المناکیوں سے زہرا قرار جیسی بیدار ذہن اور حساس دل شاعرات گزر رہی ہیں۔ زہرا قرار کی شاعری انھی گوناگوں مسائل کی نشاندہی کرتی ہے اور پوری تخلیقی قوت کے ساتھ اپنے قاری و سامع کی توجہ نئے معاملات و موضوعات کی طرف مبذول کراتی ہے۔ موضوعی وسعت پاتا ہوا یہ اظہار یہ ان کے ہاں ذاتی اعتبار سے بھی تشکیل پاتا ہے اور سماجی و عصری سطح پر بھی اپنی حسیاتی جمالیات کو برقرار رکھتا ہے۔

زہرا قرار اتر پردیش میں پیدا ہوئیں اور ان دنوں ممبئی میں مقیم ہیں۔ ذیل میں ان کے چند منتخب اشعار:

کسی نے دیکھا نہیں مجھ کو ٹھوکریں کھاتے
نظر میں آیا سبھی کے مرا سنبھل جانا

لاکھ دعائیں لکھ رکھی ہیں چوکھٹ پر
باہر اک انبار لگا ہے دھوکوں کا

تیرگی روشنی کے حق میں تھی
چور کی جیب سے دیا نکلا

اس طرف اتنا شور تھا زہرا
جانے کس کی زباں سے کیا نکلا

اگر یہ حال ہے دروازے اور دریچوں کا
کتاب پر تو بہت دھول جم گئی ہو گی

دلا رہی ہوں توجہ نئے مسائل پر
میں تھک گئی ہوں محبت پہ شاعری کر کے

میں وہاں گھوم کے آئی ہوں ابھی پچھلے برس
وہ جگہ اتنی بھی تبدیل نہیں ہو سکتی

ستارے توڑ کے لانا تمھارے بس میں نہیں
بلا سبب تمھیں اتنا تھکا دیا میں نے

حقیقتوں کو فسانہ نہیں بناتی میں
دیے جلا کے ندی میں نہیں بہاتی میں

وہ فاختہ کی علامت اگر سمجھ جاتا
تو اس کے سامنے تلوار کیوں اٹھاتی میں

میں مانتی ہوں مرا فیصلہ غلط نکلا
تمھیں بتاؤ کہ پہلے کسے بچاتی میں

نام تو خیر مجھ کو یاد نہیں
بے وفا بولتی ہوں میں اس کو

اب آگے ہم پہ ہے، ہم کیسے اس کو پھیلائیں
چلا گیا ہے وہ غاروں میں روشنی کر کے

بدلنے والی ہوں تصویر میں جگہ اپنی
کسی طرح تری دنیا میں واپسی کر کے

کوئی بھی وقت ہو، چلتی ہے وہ دکان اتنی
عجب نہیں ہے پھٹے نوٹ کا بھی چل جانا

اس سے پہلے کہ میں کہیں جاتی
وہ مری زندگی میں آ گیا تھا

ہر دم میرا دھیان تمھی پر ہوتا ہے
مجھ کو کیا معلوم تمھاری چیزوں کا

ٹھیک یہیں پر میری نظریں رکتی ہیں
سامنے والے طاق کا شیشہ ہو جاؤ

اتنا طے ہے ساتھ کہیں لے جائے گا
اس دریا کے ساتھ روانہ ہو جاؤ

ورنہ یہ آسانی مشکل کر دے گی
خوابوں کا پیچیدہ رستہ ہو جاؤ

برائی کیا ہے اگر خالی ہاتھ آئے گا
مگر وہ بچھڑے ہوؤں کی خبر تو لائے گا

جو بھر کے نکلا تھا دریا سے سوکھا مشکیزہ
کسے پتا تھا ترائی میں مارا جائے گا

میں اس سے مل نہیں پائی تھی ان دنوں شاید
یہ بات میں نے اسے بعد میں کہی ہو گی

قرار ڈھونڈ کے لائیں وہ اچھے دن کیسے
اب ان دنوں پہ فقط اچھی شاعری ہو گی

میں جانتی ہوں پرندوں سے تم کو رغبت ہے
تمھارے شہر میں کتنے شجر لگاؤں میں

سنا ہے سانپ اندھیرے میں اندھے ہوتے ہیں
ضروری ہے کہ یہاں روشنی بڑھاؤں میں

تمھارا بیگ بھی تیار کر کے رکھا ہے
اکیلی ہجر کے آزار کیوں اٹھاؤں میں

اب کے پلو سے نہیں دل سے گرہ باندھی ہے
دیکھتی ہوں کہ کوئی کیسے جدا ہوتا ہے

میری آنکھیں کبھی دھوکہ نہیں کھاتیں زہرا
وہ کبھی پاس، کبھی دور کھڑا ہوتا ہے

چوٹ ایسی کہ نشاں تک نہ ملے گا تم کو
درد ایسا ہے کہ تفصیل نہیں ہو سکتی

رکھا تھا دل پہ جو پتھر ہٹا دیا میں نے
وہ ایک راز جو سب کو بتا دیا میں نے

انھی کے دم سے کئی گھروں میں دیے جلے ہیں
یہ کچے رستے جو شاہراہوں سے جا ملے ہیں

یہ گاؤں اپنی روایتوں سے جڑا ہوا ہے
یہاں کے بچے دھنک کے رنگوں سے کھیلتے ہیں

یہ کیا کہ سب کو دعائیں دینے کے بعد زہرا
ہمارے در سے فقیر خالی پلٹ گئے ہیں

وہ جو ہر بات بھول جاتا ہے
کس طرح یاد رکھ سکے گا مجھے

اپنی مرضی سے قافلے میں ہو
تم کو شامل نہیں کیا گیا تھا

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

بن گیا رقیب جو تھا رازداں اپنا:

میاں خالق میری جھاڑ پی تو گیا لیکن اسے ہضم نہ کر سکا۔ اتفاق سے ان دنوں ریاض گجر صادق آباد میں سول جج تھا۔ بیس سال قبل اس کے والد کو ایک مربع اراضی الاٹ ہوئی تھی جو شرائط پوری نہ کرنے کی وجہ سے منسوخ ہو گئی۔ وہ اپنی تعیناتی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے گڑے مردے اُکھڑوانا چاہتا تھا اور مردہ گھوڑے کو انتظامی تازیانے سے سرپٹ دوڑانے کا خواہش مند تھا۔ اس سلسلے میں میرے پاس کئی دفعہ آیا۔ جب میں نے انکار کیا تو اس نے غصے میں کسی دیوانی مقدمے میں مجھے سمن بھجوا دیا۔ میں

نے اسے کہا کہ کسی غلط فہمی میں نہ رہے اس کے خلاف فوجداری مقدمہ بھی درج ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے جسٹس منیر خان صاحب سے بات کی۔ انھوں نے کہا اس کی تحریری شکایت کریں۔ میں نوکری سے فارغ کرا دوں گا۔ سول جج گھبرا گیا۔ شام کو جعفر اقبال ایڈوائزر اور میاں عبدالخالق مجھے ملنے آئے۔ جعفر اور اس کے والد چوہدری اقبال مرحوم کی عادت تھی کہ جب کسی خاص کام کے لئے آتے تو اپنا دایاں ہاتھ بائیں پر رکھ لیتے اور انہیں اس طرح اوپر نیچے کرتے گویا وضو کر رہے ہوں۔ بات کا آغاز بھی جی جناب حضور سے کرتے۔ خالق کی آنکھوں میں شرارت جھلکتی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص معاملہ ہے۔ چائے پینے کی نوبت ہی نہ آئی اور اس سے پہلے ہی مسئلہ حل ہو گیا۔ جعفر کہنے لگا "شاہ صاحب! آپ کو علم ہے کہ ریاض سول جج ہماری گجر برادری کا رکن ہے۔ آپ نے ایک تو اسے زمین نہیں دی حالانکہ میں نے سفارش کی تھی پھر ہائی کورٹ میں شکایت بھی لگا دی۔ یہ صریحاً زیادتی ہے۔" میں ان کے تیور دیکھ کر سمجھ گیا کہ طویل بحث یا قانونی وضاحت بیکار ہو گی۔ الیکشن سے پہلے اسی جگہ بیٹھ کر میں نے ان کا تصفیہ کرایا تھا۔ یہیں جناب جناب کہتے ان کی زبان نہ تھکتی تھی۔ آج مجھے دھمکی بھی اسی جگہ پر دینے آئے تھے۔ میں نے مختصراً کہا Jaffer! Lay your hands off. It is between me and the Judge. وہ ہکا بکا رہ گیا۔ بولا "تو میں اسے دھمکی سمجھوں؟"

"جی جو میں آئے سمجھو" وہ بغیر ہاتھ ملائے اٹھ کر چلے گئے۔

انسانی تعلقات ایک نہج پر نہیں رہتے۔ 'ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں' ہم سب میں اس قدر خامیاں اور کمزوریاں ہیں کہ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ان میں رخنہ پڑ سکتا ہے۔ دل میں بال آ سکتا ہے۔ دوستیوں پر سرد مہری کی برف پڑ جاتی ہے۔ ذاتی مفادات کی اپنی منطق ہوتی ہے۔ بسا اوقات ہمدم دیرینہ مخاصمت پر بھی اتر آتے ہیں۔ احسان ویسے تو جامع لفظ ہے جس کے لغت کے علاوہ بھی کئی معانی ہیں بشرطیکہ کوئی سمجھے۔ آج جب میں مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو زندگی کے ہر موڑ پر ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ کھڑا نظر آتا ہے۔ آدمی گلے شکوے کرے بھی تو کس سے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس لئے طوعاً و کرہاً ہی سہی آدمی کو ان تلخ حقیقتوں کو قبول کر لینا چاہئے۔

ہن تھی فریدا شاہ ول: صدیق طاہر کا شمار رحیم یار خان کے اہل ذوق حضرات میں ہوتا تھا۔ وہ مرکز کے کسی محکمے میں ملازم تھے۔ ایک دن میرے پاس آئے اور کہنے لگے شاہ صاحب! ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم خواجہ فرید کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کتابی شکل میں چھپوانا چاہتے ہیں۔ ویسے تو

پہلے بھی کئی کتب چھپ چکی ہیں لیکن وہ معیاری نہیں ہیں۔ ہم نے بڑی محنت اور تحقیق کے بعد غیر مطبوعہ حصے تلاش کئے ہیں۔ یہ نادر موقعہ ہے کہ آپ بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیں۔ گو اس وقت تک میں نے خواجہ کا پورا کلام تو نہ پڑھا تھا لیکن جو کچھ پڑھا اس نے مجھے بڑا متاثر کیا۔ خواجہ صاحب صرف روہی ہی نہیں پوری انسانیت کے شاعر تھے۔ جیسے جیسے ان کے کلام کے تراجم دیگر زبانوں میں ہو رہے ہیں ادبی حلقے بڑی حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں نے صدیق طاہر کو ہر قسم کے مالی تعاون کا یقین دلایا اور ساتھ ہی وعدہ بھی کیا کہ کتاب کی طباعت کے بعد ان کے فن اور شخصیت پر ایک قومی سیمینار کرایا جائے گا۔

جب دیدہ زیب کتاب چھپ گئی تو ہم نے نہ صرف سیمینار بلکہ آل پاکستان مشاعرے کا بندوبست بھی کیا۔ اس کے علاوہ نشیات کی روک تھام، پر بھی انگریزی زبان میں مجلس مذاکرہ کا اہتمام کر ڈالا۔ گویا ایک دن میں تین پروگرام۔ خواجہ فرید کے سیمینار کی صدارت جسٹس فضل محمود سے کرائی۔ انگریزی سیمینار کے لئے احمد محمود کو صدارت تفویض کی۔ مقررین میں برطانوی اور امریکی سفیروں کو دعوت نامے بھیجے۔ برطانیہ کا سفیر آ گیا۔ امریکی سفیر خود تو نہ آیا لیکن اس نے ایک سینئر افسر کو نمائندگی کے لئے بھیج دیا۔

جسٹس فضل محمود لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ہمارے ان سے دیرینہ مراسم تھے۔ درحقیقت وہ جج کم اور سیاست دان زیادہ تھے۔ جوانی میں شیخوپورہ سے اسمبلی کا الیکشن بھی لڑا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد سول اینڈ ملٹری گزرا اخبار میں نمائندہ خصوصی بن گئے۔ یہیں سے ان کی قسمت نے پلٹا کھایا اور میاں فضلی سے مسٹر فضل محمود بن گئے۔ ایک قلیل عرصہ میں انہوں نے اخبار کے مالک خواجہ صاحب کو پتہ نہیں کیا گیدڑ سنگھی سنگھائی کہ وہ انہیں اپنی فرزندی میں لے آیا۔ بیٹی کے علاوہ مال روڈ پر بیس کنال کی کوٹھی بھی دے دی۔ اس اثنا میں ایل ایل بی کر لیا اور اپنے تعلقات کی بنا پر جج بنا دیے گئے۔ جو لوگ میاں فضلی کی قابلیت پر شک کرتے ہیں، انہیں بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ انہیں لوگوں کو شیشے میں اُتارنے کا فن آتا ہے۔ ان کی دُور رس نگاہیں بڑے عرصے سے میاں نواز شریف پر لگی ہوئی تھیں۔ ویسے تو یہ ہر صاحب اقتدار کے ساتھ نتھی ہونے کی کوشش کرتے لیکن میاں صاحب سے بوجوہ خصوصی مراسم تھے۔ نواز شریف میدان سیاست میں ہنوز نووارد تھا اور اسے ہائی کورٹ کے جج کی شکل میں ایک مشیر مل گیا۔ انہوں نے بھی اپنے تعلقات کا بھرپور فائدہ اُٹھایا جس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی۔ جب بھی میاں نواز شریف ان کے سامنے میری تعریف کرتے یہ اس کو بھی اپنے کھاتے میں ڈال دیتے اور اسے باور کراتے کہ میری

ٹریننگ پر انھوں نے خصوصی محنت کی ہے۔ درحقیقت ہم نے جو ٹریننگ قبلہ جج صاحب سے حاصل کی تھی وہ تاش کے باون پتوں تک محدود تھی۔ Elevate ہونے سے پہلے یہ تاش کے بڑے رسیا تھے۔ ساری ساری رات نہ صرف خود کھیلتے ہمیں بھی بٹھائے رکھتے۔ وہ تو بھلا ہو ان کی بیگم کا جنھوں نے ایک صبح کلب میں چھاپہ مار کر نہ صرف ان کی شان میں پورا قصیدہ پڑھا بلکہ غزل کے چند بند ہمیں بھی عطا فرمائے۔ ایک کلب ممبر محرم علی تاجر نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس کو چپ کراتے ہوئے۔ بولیں Shutup bastered وہ بڑا خوش ہوا۔

کہنے لگے "زندگی میں انگریزی زبان میں گالی سننے کی بڑی حسرت تھی سو وہ بھی آج میاں صاحب کے طفیل پوری ہو گئی ہے۔" تو ہم پرستی ان پر ختم تھی۔ کسی دوست نے کہہ دیا کہ میاں جب تم چال چلتے ہو تو تمہارے چہرے کے تاثرات سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ تمہارے پاس کیا ہے۔ اسی لئے مات کھاتے ہو۔ اس بات کا ان پر اس قدر اثر ہوا کہ چال چلنے سے پہلے ناک پر رومال رکھ لیتے۔ یہ عادت اس قدر راسخ ہو گئی کہ جب رات کو چوری چھپے ماڈل ٹاؤن میاں نواز شریف کو ملنے جاتے تو گاڑی سے اترتے ہی چہرے کو ڈھانپ لیتے۔ ہم نے بڑا سمجھایا کہ:

بہر رنگے کی خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

آپ جو روپ بھی دھاریں لوگ آپ کو پہچان جاتے ہیں۔ میاں صاحب نے کبھی بھی ہماری اس بات سے اتفاق نہ کیا۔ اُلٹا ڈانٹ دیتے کہ بھیس بدلنے کے لئے جس مہارت اور فہم کی ضرورت ہے ہمارا ناپختہ ذہن اسے سمجھ نہیں سکتا۔ چونکہ سوچ کا ہر قافلہ ماڈل ٹاؤن کی طرف گامزن تھا اس لئے عدالتی امور پر کم توجہ دیتے۔ بالفرض کوئی فیصلہ کر بھی دیتے تو اس کے لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ جب یہ ریٹائر ہوئے تو سینکڑوں فائلیں کسمپرسی کے عالم میں ان کے پرانے، وقیانوسی اور قریب المرگ کمروں میں پڑی تھیں۔

البتہ میاں صاحب کو بڑے مفید قانونی مشورے دیتے۔ امیر المومنین بننے کا راستہ بھی انھوں نے ہی بتایا تھا۔ جب سترہویں ترمیم کا ڈرافٹ معروف قانون دان خالد انور کو دکھایا گیا تو یہ بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے مسودہ پڑھ کے جب غصے سے کہا "کس احمق اور ہونق نے یہ تیار کیا ہے" تو یہ گیدڑ کی طرح دبک گئے اور کوئی بھی اسے نہ بتا سکا کہ حضرت اس کے مصنف ہیں۔

میاں صاحب انگریزی اچھی بولتے تھے۔ قباحت صرف یہ تھی کہ اس قدر تیزی سے تڑتڑ بولتے کہ کسی کے پلے کچھ بھی نہ پڑتا۔ کبھی بھی کسی تقریب میں تیاری کر کے نہ جاتے۔ کہتے "اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں مختلف مقررین کی تقریروں سے مطلب کی بات نکال لیتا ہوں۔"

خواجہ فرید کے سیمینار میں جب انہوں نے یہ فارمولا آزمانے کی کوشش کی تو فوراً پکڑے گئے۔ مقررین نے یکے بعد دیگرے اس بات پر زور دیا کہ اکثر لوگ خواجہ فرید اور بابا فرید کے کلام کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں اور اس میں تمیز نہیں برت سکتے۔ میاں صاحب نے فلسفیانہ باتیں تو پکڑ لیں لیکن اس نکتے پر توجہ نہ دے سکے۔ چنانچہ جب انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں ایک ہی سانس میں پانچ بار خواجہ فرید کو بابا فرید کہا تو لوگوں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔

البتہ انگریزی سیمینار میں ان کا جادو چل گیا۔ ان سے پہلے جتنے مقررین نے تقریریں کی تھیں انھوں نے سب کا عطر نکال کر اپنی تقریر میں ڈال لیا اور سامعین سے خوب داد وصول کی۔

محفل مشاعرہ: رات کا مشاعرہ دو اعتبار سے منفرد تھا۔ ایک تو جناب اے جی جوش صاحب نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا کلام سنایا اور دوسرا ساری رات حاضرین جم کر بیٹھے رہے اور صبح تک کسی نے اپنی سیٹ سے ہلنے کا نام تک نہ لیا۔ جوش جی سے میری دوستی بہت پرانی تھی۔ ہماری پہلی ملاقات لائلپور میں ہوئی۔ گو عمر میں مجھ سے بڑے تھے لیکن جو لوگ انہیں ملے انہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ وہ وقت کی قید سے آزاد ہیں۔ زندہ دل، بذلہ سنج، مخلص و خوددار، معاملہ فہم اور بڑے رکھ رکھاؤ والے شخص تھے۔ شاعری کرتے لیکن کسی انجانے خوف کی وجہ سے عوام کو اپنا کلام نہ سنایا۔ شاعری صرف اسی صورت میں پنپ اور نکھر سکتی ہے جب اس کو قدردان ملتے ہیں۔ وہ لوگ جو اپنا کلام گھر کی چار دیواری تک محدود رکھتے ہیں وہ کبھی بڑے شاعر نہیں بن پاتے۔ مجھ پر جوش کی شاعری کے جوہر اس وقت کھلے جب انہوں نے میری شادی پر سہرا لکھا اور پڑھا۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ آپ کی کامیاب ازدواجی زندگی کا راز میرے سہرے کی وجہ سے ہے۔ جب میں نے انہیں مشاعرہ پڑھنے کی دعوت دی تو گھبرا گئے اور معذرت کی۔ وجہ پوچھی تو بولے "یہ گھبراہٹ اپنی وجہ سے نہیں بلکہ آپ کی خاطر ہے۔ اگر میں 'ہوٹ' ہو گیا تو مجھے تو کوئی جانتا نہیں سب نے یہ کہنا ہے کہ ڈی سی کا دوست فلاپ ہو گیا ہے۔ میں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور اپنا دو ٹوک فیصلہ سنا دیا کہ ہر حالت میں مشاعرہ پڑھنا ہے۔ بادل نخواستہ مان گئے۔ بولے! چھوٹی الائچی اور کلینسری کا بندوبست کر رکھنا، اختلاج قلب بھی ہو سکتا ہے۔

جب انھوں نے مشاعرہ پڑھا تو خلاف توقع زبردست داد ملی۔ انہوں نے نیم مزاحیہ غزل پڑھی۔ دبنگ انسان تھے۔ ان کا ڈیل ڈول اور لب و لہجہ لوگوں کو بہت پسند آیا اور انہوں نے فرمائش کر کے ایک سے زیادہ غزلیں سنیں۔ خاص طور پر ان کی پنجابی غزل کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا:

ٹلی وانگوں دل وجدا اے
جد مٹیاراں کولوں لنگھن

ہونگ مشاعرے کا لازمی جزو ہے۔ کمزور شاعر کی تو اس کے ذریعے باقاعدہ پٹائی ہوتی ہے۔ لب و لہجہ ٹھیک نہ ہو تو جگ ہنسائی ہوتی ہے اور اگر پڑھتے پڑھتے کوئی شاعر بہک جائے تو شاعر کے ساتھ سارا مجمع بھی غزل سرا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی اچھے شاعر کی بھی بھد اُڑ جاتی ہے۔ اگر تجربہ کار ہو تو سنبھل جاتا ہے۔ سادہ دل ہو تو پھسل جاتا ہے۔ محسن نقوی کا شمار پاکستان کے اچھے شعرا میں ہوتا تھا جب وہ پڑھنے آئے تو ان کا گلا کچھ خراب تھا۔ صاف کرنے کی کوشش کی تو ایک محترمہ بولیں ''نمک کے غرارے کر کے آنا تھا۔ جانتے نہیں کس شہر میں مشاعرہ پڑھنے آئے ہو۔'' وہ لڑکی ہر شاعر پر آوازے کستی۔ خود بھی مسلسل ہنس رہی تھی اور باقی لوگوں کو بھی ہنسا دیتی۔ محسن نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور موقع کی مناسبت سے زبردست غزل پڑھی۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے تو اس لڑکی پر سکتہ طاری ہو گیا۔ شعر یہ تھا:

ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کر دے
تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر

منیر نیازی حسب حال تھے۔ آفتاب شاہ انہیں پرباش کر کے لائے تھے۔ باقی شاعر تو گاؤ تکیوں پر ٹیک لگا کر بیٹھتے، وہ عمداً لیٹ آتے۔ عموماً اس وقت پنڈال میں پہنچتے جب ان کی باری ہوتی۔ کہتے ''میں ٹولہ منافقین میں نہیں بیٹھنا چاہتا۔'' اپنے سوا دیگر ہم عصروں کو شاعر نہیں مانتے تھے۔ اکثر اس کا اظہار بھی کر دیتے۔ ویسے تو ادیبوں اور شاعروں میں چشمک چلتی ہی رہتی ہے لیکن اسے مخاصمت کی حدوں تک لے جانے والے کم لوگ ہوتے ہیں۔ اچھا شاعر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان دیگر ''شاعران وطن پر زباں دراز کرے'' وہ قتیل شفائی کو فلمی شاعر کہتے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کو سرے سے شاعر مانتے ہی نہیں تھے۔ کہتے ''وہ نثر نگار ہیں وغیرہ۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا کراچی سے لے کر خیبر تک تمام معروف شعراء بلائے گئے تھے۔ لوگ مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ میں اپنے آپ کو تھپتھپا رہا تھا۔ ایک دوست کو بالآخر میں نے صف شعرا میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے بعد جوش کو کسی مدد یا سہارے کی ضرورت نہ رہی۔ بیرون ملک اور خاص طور پر پاکستان میں انہیں ہر قابل ذکر مشاعرے میں مدعو کیا جاتا۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ جی جان سے ادیبوں اور شعرا کی خدمت کرتے۔ ایک ادبی رسالہ ادب دوست نکالا اور بقول شخصے ادیبوں کے 'پوپ پال' بن گئے۔ دیوان پر دیوان شائع ہوتے گئے۔ جوش کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے کسی ادبی گروپ میں شمولیت اختیار نہ کی۔ بلکہ ہر کسی کو اپنے حلقہ ارادت میں لے آئے۔ وہ شاعر جو ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے ان کے دسترخوان پر اکٹھے ہو جاتے اور یہی اُستاد کا کمال فن تھا۔

مرے ہسپتال جا کر: تیسرے دن

امریکن ایمبیسی سے فون آ گیا۔ ہم سمجھے شکریہ ادا کرنے کے لئے کیا ہوگا۔ شکریہ تو ادا ہوا لیکن ساتھ ہی ہمیں نئی اُلجھن میں ڈال دیا۔ رابطہ افسر بولا ''سفارت خانے کی ایک افسر کل رحیم یار خان پہنچ رہی ہیں۔ اس کی سیکورٹی اور رہائش کا خاطر خواہ بندوبست کیا جائے۔ آمد کی وجہ پوچھی تو ہنس کر بولا ''کمال کرتے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ کو پتہ نہیں ہوتا کہ دوسرا کیا کر رہا ہے۔ ہر کوئی اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ جب پہنچے گی تو وجہ بھی معلوم ہو جائے گی۔'' تھوڑی دیر بعد حکومت کی طرف سے بھی اطلاع آ گئی۔ میں نے ایک مجسٹریٹ کی ڈیوٹی لگا دی اور ریسٹ ہاؤس پر پولیس کی پوری گارد بھی تعینات کر دی گئی۔ محترمہ ایک رابطہ افسر کے ساتھ پہنچیں۔ شکل صورت سے تو یوں گمان ہوتا تھا کہ ابھی ان کے کھیلنے کے دن ہیں لیکن تھی بڑی کائیاں۔ ہر سوال کا کچھ ایسا گول مول جواب دیتی جس کا کچھ مطلب نہ نکلتا۔ ہم نے بھی مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ دوسرے دن وہ علی الصبح پولیس گارد اور مجسٹریٹ کو ہمراہ لے کر خان پور چلی گئی اور ایک دکان پر چھاپہ مارا۔ تالا توڑ کے جب اندر جھانکا تو وہاں کوئلے کی چند بوریاں پڑی تھیں۔ ایک پاکستانی نے امریکہ جا کر انشورنس کمپنی کو لمبا چوڑا میڈیکل بل پیش کیا۔ وہ پاکستان میں مرگ وزیست کی کشمکش میں مبتلا رہا اور پرائیویٹ ہسپتال سے کئی ماہ علاج کرواتا رہا ہے۔ ہسپتال کے بل بھی پیش کیے۔ ڈاکٹروں کی فیس، کمروں کا کرایہ، ادویات وغیرہ۔ انشورنس کمپنی نے امریکی سفارت خانے کو درخواست کی کہ موقعہ پر جا کر اصل صورت حال کا پتہ لگایا جائے۔ کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا کرنے والا وہ واحد پاکستانی نہیں تھا۔

سوئے سوئٹزرلینڈ: مجھے رحیم یار خان آئے تین سال ہو چلے تھے۔ چھٹی لینے کا موقعہ ہی نہ ملتا۔ میری بیگم کے تین بھائی امریکن نیشنل ہیں۔ وہ اس وقت ڈلس میں مقیم تھے۔ میرے سسر کی رگ ''حاتمیت'' پھڑکی اور اس نے پوری فیملی کے ٹکٹ خرید لئے۔ مقصد ڈلس میں فیملی 'ری یونین' تھا۔ بیگم اور بچے تو پہلے چلے گئے مجھے بعد میں وہاں پہنچنا تھا۔ میں نے یوسف خان صاحب کو چھٹی کی درخواست بھجوائی تو بدک گئے۔ محرم سر پر تھے اور وہ کسی قسم کا رسک لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ کہنے لگے ''میں آپ کی درخواست آگے نہیں بھیج سکتا۔ کل کلاں محرم میں گڑبڑ ہو گئی تو میں دھر لیا جاؤں گا۔''

''تو کوئی دوسرا ڈپٹی کمشنر منگوا لیں۔ میں جب کسی چیز کا تہیہ کر لوں تو رک نہیں سکتا۔'' انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی شخص اتنی آسانی سے ضلع چھوڑنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ بولے Are you serious?

''Damn Serious'' آپ

S&GAD فون کریں میں ابھی چارج چھوڑ دیتا ہوں۔ انھوں نے میری موجودگی میں سیکرٹری S&GAD کو فون کیا۔ اسے بتایا کہ میں محرم سے پہلے چھٹی لینے پر اصرار کر رہا ہوں اور اس کے لئے ضلع چھوڑنے پر تیار ہوں۔ آخر میں جب انھوں نے یہ کہا کہ میری جگہ کسی اور کو ڈی سی لگا دیا جائے تو سیکرٹری پھٹ پڑا "خان صاحب بھول کر بھی یہ درخواست نہ کرنا۔ اس کا تو کچھ بگڑے گا نہیں، ہو سکتا ہے آپ کی چھٹی کرا دی جائے۔"

یوسف خان کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ سوچتے ہوں گے کہ کس عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ میں اُٹھ کر چلا آیا۔

شام کو چیف سیکرٹری انور زاہد صاحب کا فون آ گیا۔ بولے "شوکت یہ میری ذاتی خواہش ہے کہ تم محرم کے بعد چھٹی پر جاؤ۔ بس دس دن کی تو بات ہے۔" ان کے لہجے میں مٹھاس اور اپنائیت پن کا احساس ہوا۔ محرم تو خیریت سے گزر گیا لیکن فوراً بعد فوجی فرٹیلائزر فیکٹری میں ہڑتال ہو گئی۔ ایم ڈی بریگیڈیئر محمد احمد کا فون آیا کہ مزدوروں نے فیکٹری کا گھیراؤ کر لیا ہے اور کسی وقت بھی توڑ پھوڑ ہو سکتی ہے۔ میں ایس ایس پی کو لے کر خود موقع پر پہنچا۔ بارہ گھنٹوں کی مسلسل مغز ماری اور بحث و تمحیص کے بعد ہم نے ایگریمنٹ کروا دیا۔ دوسرے دن اے ڈی سی جی احمد سعید کو چارج دے کر میں کراچی پہنچ گیا۔

ایئرپورٹ پر فاروق احمد کسٹم انسپکٹر نے میرا استقبال کیا۔ کہنے لگا میں نے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں آپ کی بکنگ کرا دی ہے۔ جہاز نے رات تین بجے چلنا ہے۔ آپ آدھا گھنٹہ پہلے پہنچ جائیں۔ اس وقت تک سب کارروائی مکمل ہو چکی ہو گی اور ہاں! رات کا کھانا میرے ساتھ کلفٹن کے فلاں باربی کیو ہوٹل میں کھانا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میری بکنگ پنجاب ہاؤس میں ہو چکی ہے۔ البتہ کھانا ضرور کھاؤں گا۔ فاروق خان سے میری ملاقات خالد جاوید چیئرمین پی این ڈی نے کروائی تھی۔ ایک دن فون آیا کہ ان کا ایک دوست مجھے ملے گا۔ اس کا جائز کام ہے۔ ضرور کر دیں۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ ایک کسٹم انسپکٹر کی چیئرمین پی این ڈی سے کیا دوستی ہو سکتی ہے۔ پھر سی ایس پی تو بڑے پھنے خان ہوتے ہیں اور یہ تو پھنے خانوں کا بھی خان ہے۔ فاروق مجھے ملا۔ اس کی رحیم یار خان میں ایک مربع زمین تھی۔ کچھ لوگ اسے تنگ کر رہے تھے۔ میں نے کام کر دیا۔ وہ جاتے جاتے مجھے کارڈ دے گیا کہ کراچی آنا ہو تو اسے ضرور ملیں۔

شام کو فاروق پنجاب ہاؤس آ گیا۔ ہم نے کھانا بھی فرنٹیر ہوٹل میں کھایا۔ سات آٹھ پٹھان بھائی اسے مل کر چلا رہے تھے۔ گویا تھا لیکن شہر کی "کریز" بن گیا تھا۔ سمندر کا کنارہ، سوندھی سوندھی خوشبو والے گرم سیخ کباب، گہرے مصالحے میں رچے ہوئے چکن تکے اور مٹن چاپس۔

ابھی ہم کھانا کھا ہی رہے تھے کہ یونیورسٹی کی بس آ کر رُکی اس میں سے پاجامہ اور کرتے پہنے ہوئے پندرہ بیس لڑکے نکلے اور مفت کھانا کھانے کا مطالبہ کیا۔ پٹھان بھائیوں نے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے چاقو نکال لئے ادھر بھی نیفے میں اڑسے ہوئے پستول نکل آئے۔ لوگ کھانا چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ کچھ دیر تو تکرار ہوتی رہی۔ آخر میں وہ لڑکے دھمکی دے کر چلے گئے کہ کل پھر آئیں گے۔ میں نے فاروق سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ بولا روزمرہ کا معمول ہے۔ یہ وہ کراچی نہیں جو آپ نے بیس سال پہلے دیکھا تھا۔ یہ نیا کراچی ہے نئی لیڈرشپ ہے اور نئی طاقت ہے جو سکائی لیب کی طرح جہاں پر گرتی ہے سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے۔ کھانے کا مزہ کرکرا ہو گیا۔ ہم اُٹھ کر باہر آئے تو ہوٹل میں کوئی گاہک نہیں تھا۔ فاروق کہنے لگا ''اب یہ ہوٹل چل نہیں پائے گا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل جائے گی۔ کس محنت اور تمناؤں کے ساتھ بے چاروں نے ہوٹل کھولا تھا۔''

''اگر مفت کھانا کھلا دیتے تو؟'' میں نے پوچھا۔

''تو اگلے دن دو بسیں آ جاتیں'' اس کے لبوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ اُبھری۔

ایئرپورٹ پر فاروق کا اثر رسوخ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرا بورڈنگ کارڈ بن چکا تھا۔ پاسپورٹ پر Exit کی مہر لگ چکی تھی۔ میں سوئیس ایئر سے زیورچ جا رہا تھا۔ اکانومی کلاس کو فرسٹ کلاس میں Up grade کر دیا گیا تھا۔ فاروق مجھے سیدھا وی آئی پی لاؤنج میں لے گیا۔ وہاں نواب زادہ نصر اللہ خان بیٹھے تھے۔ فاروق نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ وہ ڈھاکہ جا رہے تھے کسی تنظیم نے انہیں لیکچر دینے کے لئے بلایا تھا۔ سوئس ایئر کے جہاز بہت اچھے ہیں۔ پھر فرسٹ کلاس تو دیکھنے والی ہے۔ صرف چند مسافر تھے۔ باقی سب سیٹیں خالی تھیں۔ فرسٹ کلاس کا کرایہ اکانومی کی نسبت چار گنا ہوتا ہے۔ اس میں صرف بڑے بزنس مین، کمپنیوں کے ایگزیکٹو یا پھر بااثر مفتے ہی سفر کر سکتے ہیں۔ میری ایک عرصے سے وہاں جانے کی خواہش تھی۔ اب اسے اتفاق سمجھیں کہ سوئٹزرلینڈ نے خود آ کر مجھے دعوت دی تھی۔ نجیب اللہ نیازی زیورچ میں کسی بڑی فرم میں ملازم تھا۔ وہ رحیم یار خان کے ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ اس کے والد نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ دوسری بیوی سوئیس تھی، لو میرج تھی۔ نجیب اسی محبت کا شاخسانہ تھا۔ وہ باپ کی وجاہت اور ماں کا حسن لے کر پیدا ہوا۔ باپ کی وفات کے بعد ماں کے ساتھ واپس سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔ آدمی ہوشیار تھا۔ پاکستانی جائیداد سے بھی غافل نہ رہا۔ ان کا باپ اپنی زندگی میں ہی زمینیں بانٹ گیا تھا۔ جنہیں اس کے سوتیلے بھائیوں نے ہڑپ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ سوئیس ایمبیسی سے ایسا فون کراتا کہ ساری ایڈمنسٹریشن اُٹھ کھڑی ہوتی جاتی۔ سو انتظامیہ کے ساتھ بنا کر رکھنا نجیب کی مجبوری تھی اور شوق بھی۔

[جاری ہے۔]

غزل

کس شان کے پیوند ہیں کیا چاکِ قبا ہیں
صحرا کے بگولے تری گلیوں میں گدا ہیں

تارے بھی ہمیں راہ سجھانے سے ہیں قاصر
ہم لوگ عجب دشت نوردانِ انا ہیں

فاقے ہیں، ہمیں گھر سے نکلنا نہیں آتا
آنسو ہیں مگر ہم پسِ دیوار رٹا ہیں

یہ شہر کے باسی ہیں کہ اڑتے ہوئے پتے
یہ شہر کے حاکم ہیں کہ جنگل کی ہوا ہیں

ماؤں سے بچھڑ کر بڑا مشکل ہے پنپنا
کلیوں میں جو خوشبو تھے وہ خوشبو کے گدا ہیں

ہم گھر سے چلے تھے کہ چلو دھوپ ہی دیکھیں
اے خاکِ رہِ یار! یہ اشجار سے کیا ہیں

خالد تنِ افلاس چھپائے نہیں چھپتا
کس شان کے پیوند ہیں! کیا چاک قبا ہیں

خالد احمد

غزل

اک درد نے دل سنگ میں ڈھلنے سے بچایا
اک غم نے غلط سمت نکلنے سے بچایا

اک ہجر حراست نے رکھا موم سا دل کو
اک سوچ مسافت نے پگھلنے سے بچایا

اک اشک نے تن بیچ عجب آگ لگائی
اک آگ نے دل باغ کو جلنے سے بچایا

اُس مہ نے رکھا خود میں ہمیں محو کچھ ایسے
دنیا کے چلن ساتھ بدلنے سے بچایا

اُس رہ میں، یقیں ہے کہ، کوئی گھات لگی تھی
جس رہ پہ اک آواز نے چلنے سے بچایا

بچپن جو گزروایا ہمیں تنگیِ زر میں
ہر شے کے لیے جی کو مچلنے سے بچایا

تسبیح برابر تری یادوں کی شماری
ہر عکسِ محبت کو ڈھلنے سے بچایا

قدرت نے ہمیں صحبتِ معقول عطا کی
ہم گردیِ مجہول عملنے سے بچایا

ہم دُور رہے خود ہوسِ مال سے عالی
احساس کو یہ زہر نگلنے سے بچایا

جلیل عالی

غزل

جو بظاہر تھا بہت پیار جتانے والا
وہ بھی نکلا نہ مگر ساتھ نبھانے والا

بے وفا تھا مگر اتنا بھی نہیں تھا پہلے
ہے کوئی بیچ میں دیوار اُٹھانے والا

اس قدر لوگ ہیں مصروف دکھوں میں اپنے
کوئی ملتا نہیں اب ہنس کے پلانے والا

کاٹ لے جائے گا پت جھڑ میں تری شاخیں بھی
تپتے موسم میں تری چھاؤں میں آنے والا

یہ ترے راز بھی اوروں پہ کرے گا افشا
راز اوروں کے تجھے آ کے بتانے والا

اُس سے اخلاص و مروت کی توقع کیسی
پھول گلدان میں کاغذ کے سجانے والا

ہم وہ خوش فہم کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں سکون
"دوست ہوتا ہے ہر اک ہاتھ ملانے والا"

سلطان سکون

غزل

بیٹھنے کے لیے معقول جگہ ہے کہ نہیں
آؤ دیکھیں ، کوئی میخانہ کھلا ہے کہ نہیں

بالارادہ نہیں آئی کبھی ہم پر وہ نظر
پھر بھی ہر تیر نشانے پہ لگا ہے کہ نہیں

اُس نے یہ دیکھ کے بخشا ہے رفاقت کا شرف
آدمی بندۂ تسلیم و رضا ہے کہ نہیں

بے بسی طاقتِ برداشت بڑھا دیتی ہے
ہم پہ جو وقت بھی آیا وہ سہا ہے کہ نہیں

حال کی عمر میں ماضی کی ہیں عمریں شامل
نونہال اپنے بزرگوں سے بڑا ہے کہ نہیں

فرض تھوڑی ہے کہ ہر مشورہ مانا جائے
دیکھنا چاہیے ، یہ بات بجا ہے کہ نہیں

شیخ صاحب کو نہیں کونسی نعمت حاصل
نیکیوں کی اِسی دنیا میں جزا ہے کہ نہیں

مارے جاتے رہے عشاق مگر کم نہ ہوئے
عشق کو عالمِ فانی میں بقا ہے کہ نہیں

آپ کے منہ سے بھی نکلا ہے کوئی سچ تو شعور
سُننے والوں پہ اثر اُس کا ہوا ہے کہ نہیں

انور شعور

غزل

بند جو راستہ ہُوا نہیں ہے
مُجھ پہ وہ بھی کُھلا ہُوا نہیں ہے

معذرت، اے خدا، ہُوا نہیں ہے
تیرا حق تو ادا ہُوا نہیں ہے

وہ کہے سے مُکر گیا، بولا
یہ تو میرا کہا ہُوا نہیں ہے!

لوحِ محفوظ کے مطابق تھا!
کچھ بھی بے ضابطہ ہوا نہیں ہے

اصل میں ہے وہی یہاں آزاد
قید سے جو رہا ہوا نہیں ہے

مَیں نے بھی کی کسی کی حق تلفی
میرا حق بھی ادا ہوا نہیں ہے

جسم تو ہو چکا نڈھال، مگر
ذہن اتنا تھکا ہوا نہیں ہے

میری کوشش یہی رہی کہ کہوں
پہلے کا جو کہا ہوا نہیں ہے

زندگی منتیں کرے جتنی
موت کا التوا ہوا نہیں ہے

کتنی تبدیلیاں بدن میں ہوئیں
روح کا ارتقا ہوا نہیں ہے

کام آیا ہوں مَیں اُسی میں نسیم
معرکہ جو بپا ہوا نہیں ہے

نسیمِ سحر

غزلیں

میں بھٹک رہا ہوں، کمال ہے، ترے شہر میں
فقط ایک تجھ سے سوال ہے ترے شہر میں

ملا جو بشر تھا وہ بے خبر ترے حال سے
عجب آگہی کا زوال ہے ترے شہر میں

تجھے کیا خبر، تجھے کیا خبر، تجھے کیا خبر
مرا شوق کتنا نڈھال ہے ترے شہر میں

جو چلا گیا ترے شہر سے، تھا وہ آشنا
ترے بعد جینا محال ہے ترے شہر میں

ہے یہ آرزو ترے ہاتھ میں مرا ہاتھ ہو
مرا بھولپن بھی کمال ہے ترے شہر میں

مرا ہجر گرچہ تڑپ رہا ہے وصال کو
تجھے دیکھنا تو محال ہے ترے شہر میں

مجھے واہموں کے حصار میں ہی رکھا گیا
مرے دشمنوں کی یہ چال ہے ترے شہر میں

یعقوب پرواز

ہر چند ہوں میں طفلکِ نادان کی طرح
ڈالی ہے میں نے اک نئے امکان کی، طرح

وہ بھی فریب کار ہی نکلا مآل کار
رکھا تھا جس کو میں نے دل و جان کی طرح

کس بات پر میں دامنِ امید چھوڑ دوں
کب تک رہوں میں شہر میں انجان کی طرح

کوئی تو ہم مقام ہمارا بھی ہے یہاں
گمنام تم بھی ہو مری پہچان کی طرح

رکھتے ہیں لوگ میرے شب و روز پر نظر
ہر شخص میرے حق میں ہے نگران کی طرح

کھلتی نہیں کسی سے بھی پیچیدگی مری
حالانکہ ہوں میں عقدۂ آسان کی طرح

یہ بھید کھل ہی جائے گا پرواز میرے بعد
گھر میں تھا کوئی قیمت سامان کی طرح

غزل

آجکل دیکھتے رہتے ہو جو کاسہ مرے پاس
ہُوا کرتا تھا یہ پہلے یدِ بیضا مرے پاس

اضطرابِ شبِ تنہائی کچھ اُس پر بھی کُھلے
اگر آ جائے کسی شام وہ تنہا مرے پاس

عمر بھر میں نے جو خوشیاں نہ سمیٹی ہوتیں
اسقدر درد کا سرمایہ نہ ہوتا مرے پاس

خلوت آرائی بھی میری ہے تمہارے دم سے
تم جو ہوتے نہیں کوئی نہیں ہوتا مرے پاس

لوگ کر دیتے زمانے کے حوالے مجھ کو
آج ہوتا نہ اگر تیرا حوالہ مرے پاس

پھر محبت میں یہ شاید مرے کام آ جائے
اب کہ باقی ہے جو تھوڑا سا بھروسہ مرے پاس

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ٹھوڑیوں تک گردنوں میں طوق ہیں
رنگِ دنیا احتسابی ہو گیا

غزلیں

اگر ہے خام تو یہ عشق ڈگمگا دے گا
ہے پختہ کار تو پھر راستہ دِکھا دے گا

نہیں قبول دوبارہ سے مسندِ افلاک
یہ ڈر ہے اَب کے وہ نظروں سے ہی گرا دے گا

مَیں اپنی مرضی سے بیٹھا ہُوا نہیں ہُوں یہاں
سو کیوں وہ بزمِ جہاں سے مجھے اُٹھا دے گا

کہاں سے آئے ہیں، معلوم ہے یہ قصہ تو
کہاں کو جانا ہے وہ وقت پر بتا دے گا

زمیں پہ آئے ہیں، گھومیں پھریں نظارہ کریں
دوبارہ کون ہمیں اذنِ سیر کا دے گا

خاور اعجاز

شعلۂ عشق تو شبنم میں بدل جائے گا
دلِ ناداں مگر اِس کھیل میں جل جائے گا

آتشِ شوق بجھی، صرف دھواں باقی ہے
سانس لیتے ہیں تو اَب دَم ہی نکل جائے گا

وہ مِری آنکھ میں ٹھہرا ہُوا ہے کچھ دن سے
اُس کا جادو مجھے لگتا ہے کہ چل جائے گا

شہر میں گھومتی پھرتی ہے اجل یہ کہہ کر
بچ گیا آج اگر کوئی تو کل جائے گا

گِرنے والا ہی سہی تیرا گرفتارِ وفا
ایک ٹھوکر جو لگے گی تو سنبھل جائے گا

مجھے بیکار نہیں بیٹھنا افلاک پہ بھی
میرے ہمراہ مِرا ذوقِ عمل جائے گا

غزل

ابل رہا ہے جو لاوا یہیں سے گزرے گا
لپکتی آگ کا دریا یہیں سے گزرے گا

نظامِ ظلمتِ شب ختم ہونے والا ہے
سنا ہے سرخ سویرا یہیں سے گزرے گا

یہ سبز کھیت جنہیں ہم نے خود اجاڑ دیا
ذرا سی دیر میں صحرا یہیں سے گزرے گا

اسے خبر ہے کہ بزدل ہیں بستیوں والے
وہ شہسوار اکیلا یہیں سے گزرے گا

یہاں نہ گھر ہے نہ منزل نہ راستہ اس کا
مگر وہ خاک اڑاتا یہیں سے گزرے گا

قدم قدم پہ درختوں کا اہتمام کرو
سبا سے اڑ کے پرندہ یہیں سے گزرے گا

میں اس کی راہ میں کانٹے نہیں بچھاؤں گا
مجھے خبر ہے پیادہ یہیں سے گزرے گا

فقیر کس لیے بیٹھے ہیں اس کی راہوں میں
یہ طے نہیں وہ ہمیشہ یہیں سے گزرے گا

خلا میں گھورتا رہتا ہوں رات دن باقی
کہ جیسے میرا ستارا یہیں سے گزرے گا

باقی احمد پوری

غزل

جھونپڑی کو کہیں گھر ہوتے ہوئے دیکھا ہے
کہیں محلوں کو کھنڈر ہوتے ہوئے دیکھا ہے

ہم نے تاریخ کی آنکھوں سے کئی بار یہاں
ظلمتِ شب کو سحر ہوتے ہوئے دیکھا ہے

بے سکوں پائے سبھی اہلِ تکاثر ہم نے
تنگ دستوں کی گزر ہوتے ہوئے دیکھا ہے

وقت نے جن کو سرِ آنکھوں پہ بٹھایا تھا، اُنھیں
ایک دن مُلک بدر ہوتے ہوئے دیکھا ہے

ڈریے مظلوم کی آنکھوں میں رُکے ساون سے
ہم نے اشکوں کو گُہر ہوتے ہوئے دیکھا ہے

اَن گنت لوگ تھے یاں محوِ سفر، جانِ انیس!
جن کو پھر گردِ سفر ہوتے ہوئے دیکھا ہے

محمد انیس انصاری

غزل

خدا کا نام لے، اے آسمان ، رہنے دے
کسی جگہ پہ تو ، امن و امان رہنے دے

تجھے بھی علم ہے، اور میں بھی جانتا ہوں، تو پھر
تو میری قوم کا اب امتحان رہنے دے

امیرِ شہر ! اماں دینا میرے ذمے ہے
میں وعدہ کر چکا ، میری زبان رہنے دے

کسی بھی دھوکہ، دغا اور فریب میں مت آ
بھلا دے راہ جو ، ایسی اڑان رہنے دے

میں جانتا ہوں، کہ ہے دل میں کیا، زبان پہ کیا
مجھے سبق نہ پڑھا ، میری جان ! رہنے دے

اب ایسا کچھ نہیں ہونے کا ، ایسے ہاتھ نہ مل
کہا نہیں تھا ، حدف پہ دھیان رہنے دے

تھی کوئی بات ، کیا راز میں شریک تجھے
تو راز ، راز ہی، اے راز دان! رہنے دے

اکرم ناصر

غزل

بخوبی دیکھا بھالا ہے ہمارے عہد کا موسم
لہو رت کا حوالہ ہے ہمارے عہد کا موسم

مثال ایسی ملے گی کب بھلا تاریخ کے اندر
کہ طوفانوں نے پالا ہے ہمارے عہد کا موسم

اسے تقدیر کا لکھا کہا جائے تو بہتر ہے
ہر اک دکھ نے اچھالا ہے ہمارے عہد کا موسم

یہاں تاریکیوں میں ڈوبی راتوں کے سوا کیا ہے
کہ اشکوں کا ہی نالہ ہے ہمارے عہد کا موسم

زباں سے شکوۂ حالات کرنا بھی کہاں ممکن!
لبوں پر جیسے تالا ہے ہمارے عہد کا موسم

نگاہیں خونی دریا کے تصور سے لرزتی ہیں
خزاں کی رت کا ہالہ ہے ہمارے عہد کا موسم

مرا دل ہے سمندر کی طرح گہرا، تو کیا جانے
گلے اشکوں کی مالا ہے ہمارے عہد کا موسم

جسے اقبال پڑھنے کا ارادہ ہم نہیں کرتے
بہت مشکل رسالہ ہے ہمارے عہد کا موسم

اقبال سروبہ

غزل

خارزاروں میں دھنک کا سلسلہ آوارگی
دے گئی راہوں کو پھولوں کی ردا، آوارگی

مانگتے ہیں رب سے ہم صبح و مسا، آوارگی
جامِ مے، برکھا کی رُت کالی گھٹا، آوارگی

قافیہ لکھا تو سوچا، کونسی رکھوں ردیف؟
دل نے محسنؔ کی اجازت سے کہا، آوارگی

دشت سے پوچھا جو میں نے کون ہے ساتھی میرا؟
تب ہوا نے ریگ صحرا پر لکھا، آوارگی

اپنے ویرانوں کی رونق کو بڑھانے کے لیے
ہم سے دیوانوں کو دیتا ہے خُدا، آوارگی

میں نے پوچھا، کیا ہمارے عشق کا انجام ہے؟
مسکرا کر اُس نے چپکے سے کہا، آوارگی

بس نظر آتے ہیں اب تو چیتھڑے سے جسم پر
نوچ لیتی ہے بدن سے ہر قبا، آوارگی

لے گئی عشقِ مجازی سے حقیقی عشق تک
ہم کو قسمت سے ملی معجز نما، آوارگی

عمر بھر جاگے ہوئے آئے تری آغوش میں
لوریاں دے کر ہمیں اَب تو سُلا، آوارگی

میری حالت دیکھ کر وہ دیر تک روتا رہا
پھر طبیبِ عشق نے لکھی دوا، آوارگی

ہم کبھی بھی گھونسلوں میں لَوٹ کر آتے نہیں
اپنے بال و پَر میں رہتی ہے سدا، آوارگی

جس کی چھت کوئی نہ ہو، دیوار، در کوئی نہ ہو
دشت میں میرا بھی ایسا گھر بنا، آوارگی

ہم محبت میں روایت کے کبھی قائل نہ تھے
عشق اپنا ہے الگ، اپنی جُدا آوارگی

اس کی خوشبو میری آنکھوں میں مجسم ہو گئی
یہ ترا ادنیٰ سا ہے اک معجزہ، آوارگی

مال و زر کی ہم کو حاجت ہی نہیں کوئی عقیلؔ
ہم فقیروں نے تو بس مانگی دعا، آوارگی

عقیل رحمانی

غزل

بڑھا کے دوریاں جینا نہ اب حرام کریں
گئے دنوں کے مراسم کا احترام کریں

میں جانتا ہوں حضور آپ ہیں بہت مصروف
جو ہو سکے تو کوئی شام میرے نام کریں

قدم قدم پہ یہاں ظلمتوں کے سائے ہیں
اُچھالیں اب نیا سورج اجالے عام کریں

چلو فلک کو زمیں کی جگہ بچھاتے ہیں
چلو زمین کو اب چرخِ نیلی فام کریں

سبیل کوئی تو ہو وہ بھی زیرِ دام آئے
کوئی طریقہ بتاؤ کہ اُس کو رام کریں

چمن کے پھول پڑے ہیں تمھاری راہوں میں
وہ منتظر ہیں ذرا اُن پہ اب خرام کریں

جو موت بانٹتے رہتے ہیں روز قسطوں میں
کرم وہ اتنا کریں کام یہ تمام کریں

ہیں سجدہ ریز وہ کب سے تمھاری چوکھٹ پر
بتاؤ اور بھلا کیا ترے غلام کریں

وہ آنکھوں آنکھوں میں سب کچھ بتا گئے ہیں جلیلؔ
کئی ہیں منتظر اب بھی وہ کچھ کلام کریں

احمد جلیل

غزل

وہ جو اک تخت تھا ہمارے لیے
چھوڑ آیا ہوں وہ تمھارے لیے

یہ زمانہ ہے سود کاری کا
آنکھ نے خواب تک ادھارے لیے

تیرے وعدوں نے باندھ رکھا ہے
کشتیاں چھوڑ کر کنارے لیے

ہار جائیں نہ روزگار سے جنگ
اک دعا کیجیے ہمارے لیے

اپنے پیروں پہ آ گرا ہے مکاں
گرنے والوں نے کب سہارے لیے

اُس نے دامن میں بھر دیئے شعلے
میں نے جن کے لیے ستارے لیے

آغا نثار

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

غزلیں

صدیوں سے یہ عشق ہمارے واسطے اک تمثیل سا ہے
کسی پنوں کا قصہ بھی بالکل چاند اور جھیل سا ہے

کچھ تو فرق روا رکھتا وہ جرح اور جراحت میں
قاتل کا انداز عدالت میں بھی ایک وکیل سا ہے

موسیٰ اور فرعون کا جھگڑا یاد ہے فرفر پانی کو
اس قصے کا عینی شاہد کون یہاں پر نیل سا ہے

مسعود احمد

جیسے کوئی محنت کش ہو گھر سے دور اقامے پر
دل کے ساتھ رویہ اس کا کیسے عام کفیل سا ہے

چودھویں رات سمندر میں جو چاند کو دیکھ کے اٹھتی ہیں
ان لہروں کا پاگل پن بھی تو مضبوط دلیل سا ہے

پھر پہلی سے دسویں تک یہ بلا تعطل برسیں گی
غم اور نم کی آمیزش کا بندوبست سبیل سا ہے

تنہائی میں جتنی بار بھی اندر جھانک کے دیکھا ہے
رب کا گھر یہ کالا کوٹھا ابراہیم خلیل سا ہے

خواب خیال کے اس میں جانے کتنے جنتر منتر ہیں
شاعر کا یہ بستہ بھی تو عمرو کی زنبیل سا ہے

عمر خطاب نے ایک وہی ہے جسکو رقعہ بھیجا تھا
دوسرا کونسا دریا ہے جو اس دھرتی پہ نیل سا ہے

غزل

مہرِ لب کھول اے مرے دوست
منہ سے کچھ بول اے مرے دوست

پھر ملاقات ہو گئی دیکھ
ہے زمیں گول اے مرے دوست

بھول کر دل سے اپنا ہر غم
ساتھ میں ڈول اے مرے دوست

خود کو استاد کہتے ہو اور
شعر میں جھول اے مرے دوست

اور کتنے ہیں پاس تیرے
چہرے کے خول اے مرے دوست

کچھ بھی کہنے سے پہلے اپنی
بات کو تول اے مرے دوست

ہو گئی ہجر میں ترے آنکھ
چاہ کا ڈول اے مرے دوست

کھول کر رکھ دیے ہیں راحت
وقت نے پول اے مرے دوست

راحت سرحدی

غزل

در سماعت کا باز رکھتے ہیں
چپ تو رہتے ہیں پھر بھی نظروں میں
آنکھ کو بے نیاز رکھتے ہیں
سب نشیب و فراز رکھتے ہیں

اپنی ہستی کا ، اپنی مستی کا
عشق تکمیل تک نہیں پہنچا
کچھ نہ کچھ تو جواز رکھتے ہیں
ہم ادھوری بیاض رکھتے ہیں

ہم تو وہ ہیں جو اپنے سینے میں
یہ بھٹکنا ہے اور بات مگر
راز داروں کے راز رکھتے ہیں
رُخ تو سوئے حجاز رکھتے ہیں

پوچھئے ! ہم سے بھی کہ عشق ہے کیا
ہم بھی دل میں گداز رکھتے ہیں

خالد معین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

غزل

یہاں پہ ہر کوئی اپنے مرکز سے ہٹ گیا تھا
جو اک مکاں تھا وہ چند کمروں میں بٹ گیا تھا

کوئی زمانہ تھا رہ رہے تھے یہاں پرندے
میں گھر کے دیوار و در سے جا کے لپٹ گیا تھا

خبر نہ رکھی کہ کس کی وسعت کہاں کہاں ہے
میں اپنے حصّے کے سائے باں میں سمٹ گیا تھا

پتا چلا تھا کہ تو بھی دنیا میں کوئی شے ہے
میں اتفاقاً جو تیرے آگے سے ہٹ گیا تھا

مجھے بھی دشتِ جنوں میں تادیر رہنا پڑتا
میں خوش مقدر تھا کام جلدی نپٹ گیا تھا

میں ریزہ ریزہ نہیں ہوا ہوں محبتوں میں
بطرزِ شیشہ بڑی سہولت سے کٹ گیا تھا

ہماری آنکھوں کے ضبط میں تھا اثر کچھ ایسا
ندی میں سیلاب آتے آتے پلٹ گیا تھا

وہیں پہ عمریں گزارنا پڑ گئی تھیں طالب
جہاں سے دو پل میں جی ہمارا اچٹ گیا تھا

طالب انصاری

غزل

محرمِ ہست و بود کیا
ہر رہ کو مسدود کیا

حاضر ہونا چاہتے تھے
اُس نے لا موجود کیا

کس کی اجازت سے تو نے
میرے زیاں کو سُود کیا

پہلے خلق کیا مقصد
پھر خود کو مقصود کیا

رستہ آگے جاتا تھا
ہم نے ہی محدود کیا

ایک آوارہ نظر نے سحرؔ
شاہد کو مشہود کیا

حسنین سحرؔ

غزل

جتنا مرے آس پاس غم ہے
یہ کشتِ حیات اسی سے نم ہے

مجھ کو وہ بتا دیا گیا ہے
جو لوحِ حیات پر رقم ہے

تو کر دے ناتمام مجھ کو
یہ عمر تو آرزو سے کم ہے

کچھ اور دے اپنا وقت مجھ کو
اب مجھ میں دم ہے اور نہ خم ہے

زندہ کوئی یہاں نہ دیکھا
یہ دنیا ہے کہ اک عدم ہے

ہارون الرشید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تجھ سے تو اٹھ سکے گا نہ یہ بارِ دوستی
مجھ پہ نہ آ پڑے کہیں دیوارِ دوستی

غزل

اسی میں ہی اب صرف ڈھلتے بنے
تری بزم سے کب نکلتے بنے

ترے پاس آ کے ہوا ہے یہ کیا
ٹھہرتے بنے اور نہ چلتے بنے

زباں سے ہو کیسے مسخر فلک
کھلیں بازو تب تو اچھلتے بنے

اکیلے ہی سیرِ چمن کیا کروں
ترا ساتھ ہو تو ٹہلتے بنے

اگر تو نہ آ اپنی یادیں ہی بھیج
کسی طور تو دل بہلتے بنے

ہوا ہے بدن سارا یخ بستہ سا
ملے آنچ تب تو پگھلتے بنے

یہ بھرپور حسن و شباب الاماں
ترے سامنے سے نہ ٹلتے بنے

کبھی تو بھی مجھ کو منانے کو آ
کبھی مجھ کو بھی تو مچلتے بنے

بدن کی تپش ہے غضبناک کیا
اسی میں مگر روز جلتے بنے

ذکی طارق

غزل

جھڑتا ہے اگر تن کا بُرادہ مری رادھا
چلنے دو یونہی ساغر و بادہ مری رادھا

بھاری ہوں تو پھر پاؤں پھسلنے نہیں پاتے
شانوں پہ رہے بوجھ زیادہ مری رادھا

ڈھل جائے ترے حسن کا سورج ہی کسی روز
میں خاک میں رہ جاؤں مبادا مری رادھا

وہ ہونٹ ابھی پھول بنانے میں مگن ہیں
ظاہر نہ کرو اپنا ارادہ مری رادھا

سنگھار ترے حسن پہ پھیکا ہی لگے گا
دلکش ہے ترا روپ یہ سادہ مری رادھا

ہر روز ترے پاؤں کی مہکار کو ترسے
اک عمر سے سُونا پڑا جادہ مری رادھا

فرصت ہی نہیں کارِ زمانہ سے میسر
پہنا ہے مگر عشق لبادہ مری رادھا

لازم ہے کسی روز وہ جی بھر کے نوازے
دامن جو رہے تیرا کشادہ مری رادھا

افتخار شاہد

غزل

خواہشوں اور اُلجھنوں کا کارواں ہے زندگی
ہر قدم پر اک نیا ہی امتحاں ہے زندگی

کون پڑھ سکتا ہے اس کو مختصر سی عُمر میں
داستاں در داستاں در داستاں ہے زندگی

دربدر پھرتی ہے جانے کیوں کبھی رُکتی نہیں
کھوج میں کس بے وفا کی سرگراں ہے زندگی

بخت دوری کا سبب تھا کل ہمارے درمیاں
آج کیسا وقت آیا درمیاں ہے زندگی

ایک دوجے کے غموں کو پھر سمجھتے کس طرح
تم کہاں ہو میں کہاں ہوں اور کہاں ہے زندگی

مُتفق ہیں اس حقیقت پر جہاں والے سبھی
مہرباں ہے موت اور نامہرباں ہے زندگی

میں تقاضے اس کے سارے تو نبھا سکتا نہیں
کس لیے جانے یہ شاہدؔ بدگماں ہے زندگی

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

دیوارِ خستگی پہ اداسی اُگی ہوئی
اور اُس میں اک شبیہہ پرانی چُھپی ہوئی

بے خواب سی وہ آنکھ ترے شہرِ خواب میں
جیسے پرانی جھیل پہ کائی جمی ہوئی

آدھی ہے صُلح جُو تو رہی آدھی جنگ جُو
دنیا ہے تیرے نام پہ اب بھی بٹی ہوئی

اسکو وفُورِ شوق نے مارا کہ بُھوک نے
کچھ پوچھتی ہے پُھول پہ تتلی مری ہوئی

آ دیکھ میری آنکھ میں کالی گھٹائیں ہیں
آ دیکھ مجھ میں آگ ہے کتنی چھپی ہوئی

ہم کو سنہری دھوپ کا میلہ نہیں ملا
تاباں ہماری آنکھ تھی شب کی بجھی ہوئی

عبدالقادر تاباں

غزل

میں بے بس تھا سو مڑ کر دیکھتا تھا
مری بستی کو دریا چاٹتا تھا

پرندہ ڈھونڈتا پھرتا تھا شاخیں
کہ جن کے بیچ اس کا گھونسلا تھا

زمیں سے رابطہ کٹ سا گیا تھا
سروں پر آسماں گرنے لگا تھا

سفر درپیش تھا لاحاصلی کا
گماں کی دھند تھی اور قافلہ تھا

رتیں نامہرباں سی ہو چلی تھیں
فضاؤں میں عجب اک خوف سا تھا

طناب خیمہ اکھڑی جا رہی تھی
ہوا سے دشت سارا گونجتا تھا

چھتیں بھی محوِ گریہ تھیں مسلسل
در و دیوار پر ماتم بپا تھا

کوئی لوٹا تو خود سے یہ کہے گا
یہاں اک شہر ہنستا بولتا تھا

کھلونے تیرتے تھے آنکھوں میں
کوئی حسرت سے ان کو دیکھتا تھا

جسے موجیں نگلتی جا رہی تھیں
مرے بچپن کا کوئی واقعہ تھا

کہیں کچھ خواہشیں بکھری پڑیں تھیں
کہیں خوابوں کا ملبہ سا پڑا تھا

خبر تھی ڈوبتی فصلوں کو شاید
کسی کا دل بھی ڈوبا جا رہا تھا

نذر عابد

غزل

خدا ہی جانے اچھالے کس نے فضائے الفت میں رمز ڈر کے
چراغ اوندھے پڑے ہوئے ہیں، درخت خاموش رہ گزر کے

دعا کے بازو تھکے ہوئے ہیں اڑان بھرنا نہیں ہے آساں
کوئی شکنجے میں کس رہا ہے کبوتروں کو دل و نظر کے

عجیب دہشت کا دائرہ ہے اور اس میں ہم لوگ جی رہے ہیں
مرے ہوؤں کو سنا رہے ہیں سنہری حالات چشم تر کے

یہ گیت میرے ہیں میرے ہونے کے شاہ پارے تجھے خبر ہو
تو اپنے ہونے کی اب سند لا نہ چھیڑ قصے ادھر ادھر کے

عزیز کمیاب ہے محبت غرض نے رشتوں میں پھوٹ ڈالی
بدل گیا ہے چلن جہاں کا نئے تقاضے ہیں بام و در کے

عزیز عادل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گیت سے گیت کی بالی پھوٹی، دانے دانوں سے نکلے
سنگ کی قید سے چھوٹے چشمے، تیر کمانوں سے نکلے

غزل

بارشِ خون کے آثار نظر آتے ہیں
جتنے تارے ہیں وہ خونخوار نظر آتے ہیں

مَیں اکیلا ہی عدالت میں کھڑا ہوں کب سے
لوگ حاکم کے طرفدار نظر آتے ہیں

مَیں تو جاں رکھ کے ہتھیلی پہ چلا آیا ہوں
آپ دنیا کے خریدار نظر آتے ہیں

مَیں نے دیوانے جو کچھ چاک گریباں دیکھے
یہ مجھے صاحبِ اسرار نظر آتے ہیں

دامِ ہمرنگِ زمیں کا یہ کرشمہ دیکھا
جتنے طائر تھے، گرفتار نظر آتے ہیں

ہمسفر جب سے ہوا راہِ وفا میں کوئی
راستے زیست کے ہموار نظر آتے ہیں

جعفری مَیں نے کہے شعر جو خلوت گہہ میں
وہ سبھی رونقِ بازار نظر آتے ہیں

مقصود جعفری

غزل

سینہ سپر ہوں سامنے سارے جہاں کے ہم
ایسے کہاں کے آپ تھے، ایسے کہاں کے ہم

ملنا تو خاک میں تھا چلو، مل کے جی لیے
جی خاکداں کے آپ تھے اُس خاکداں کے ہم

جنت کی آرزو تھی نہ دوزخ کا خوف تھا
اتنے کہاں اسیر تھے سود و زیاں کے ہم

ہم نے تمھارے ہجر میں رہ کر گزار دی
کس نے کہا مکین تھے اپنے مکاں کے ہم

کس سمت میں سفر ہے، ہمیں کچھ خبر نہیں
چلتے ہیں ساتھ ساتھ مگر کارواں کے ہم

ہجر و وصال قصۂ پارینہ ہو گئے
کردار تھے حریم اسی داستاں کے ہم

حریم حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دستکیں دیں، دل آوارہ نے دَر دَر خالد
حیرتی نے یہ بیاباں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

غزل

کیا ہے ترا کترا کے گزرتے ہوئے ملنا
ملنا بھی سرِ راہ تو ڈرتے ہوئے ملنا

باہر سے سنبھالے ہوئے رکھتا ہے بدن کو
اندر سے مگر ہم کو بکھرتے ہوئے ملنا

ناگاہِ نظر آئیں سرِ راہ تو ہم سے
کچھ دیر کنارے پہ ٹھہرتے ہوئے ملنا

ممکن ہے کہ بن جائے تعلق کی پھر اک شکل
الزام مرے سر کوئی دھرتے ہوئے ملنا

سچائی کو پردوں میں چھپایا نہیں کرتے
کیوں ہم کو ندیم اُس سے بھی ڈرتے ہوئے ملنا

خنکی میں ندیم آتا ہے ملنے کا مزہ بھی
تم اب کے پہاڑوں سے اُترتے ہوئے ملنا

ریاض ندیم نیازی

غزل

قدم قدم پر ایک نئی ہلچل دیتا ہے
پہلے مشکل پھر مشکل کا حل دیتا ہے

میں بھی وہی لفظوں کی بساط بچھا دیتی ہوں
وہ بھی کوئی چال پُرانی چل دیتا ہے

تلخی اپنی نوکِ زباں پر جم سی گئی ہے
ہم نے سنا تھا صبر تو میٹھا پھل دیتا ہے

پہلے دِکھائے دور سے ہری بھری راہیں
اور پھر چلنے کو جنگل دیتا ہے

سرحد کے اس پار عجب سی خاموشی ہے
دُشمن شاید رسّی کو پھر بل دیتا ہے

پہلو سے اُٹھتے اُٹھتے ، جاتے جاتے
کیسا رنگ مرے چہرے پہ مَل دیتا ہے

رخشندہ نوید

غزل

رفتار کے بہاؤ میں امکان بہہ گئے
گریہ کرو کہ سینکڑوں انسان بہہ گئے

اک زیرِ آب آیا ہوا شہرِ خواب ہے
دیواریں جس کی ڈھے گئیں، دالان بہہ گئے

جذبوں کی نقل و حمل معطّل ہے اِن دنوں
سب رابطے کے پُل سرِ طوفان بہہ گئے

سوئے ہوئے تھے ہم کہ تلاطم نے آ لیا
سپنے ہمارے نیند کے دوران بہہ گئے

آیا نہیں ہماری مدد کے لیے کوئی
ہم موج پر تھے، بے سروسامان بہہ گئے

سیلاب پر لکھی ہوئی نظمیں چھلک پڑیں
سطریں اُلٹ پلٹ گئیں، عنوان بہہ گئے

بدنظمیٔ جہان کے گہرے الم پہ ہم
اتنا غزل میں روئے کہ اوزان بہہ گئے

سب سے بلند لہر پہ ہم تم سوار تھے
پھر جانیے کدھر اِسی دوران بہہ گئے

واپس تمھیں کنارے پہ لانا محال ہے
جذبات میں تم اتنا مری جان بہہ گئے

اب اپنے رفتگاں سے کہاں ملنے جائیں ہم
یارب! ہمارے شہرِ خموشان بہہ گئے

ہر سَمت کی اساس میں داخل ہُوا بھنور
حتیٰ کہ شش جہات کے ایوان بہہ گئے

اِن وادیوں میں گھومنے آتا نہیں کوئی
مدت ہوئی یہاں کے پرستان بہہ گئے

شاہد وہ سرکشی ہے تجاذب کی لہر میں
جس میں ہزاروں عالمِ امکان بہہ گئے

شاہد ماکلی

غزل

مجھ کو بے شک دلِ ناکام سے جانا جائے
تُو جہاں جائے مرے نام سے جانا جائے

تری پہچان گلِ لالہ ہے میں جانتا ہوں
مجھ کو بھی بادۂ گلفام سے جانا جائے

تم تو افسانوی کردار ہو یہ مان لیا
میں تو شاعر ہوں مرے کام سے جانا جائے

گھر کی پہچان مکینوں سے ہُوا کرتی ہے
وہ مکاں ہے جو در و بام سے جانا جائے

پاس بیٹھو مجھے تفصیل سے سب بتلاؤ
مسئلہ تیرا یہ آرام سے جانا جائے

کیا ترے دل میں محبت کی رمق باقی ہے
کیسے ممکن ہے کہ الہام سے جانا جائے

آگرہ زندہ ہے تو تاج محل کے دم سے
جس طرح مصر بھی اہرام سے جانا جائے

لوگ مجھ کو نہیں جبرانؔ اُسے جانتے ہیں
پھول خوشبو ہی کے پیغام سے جانا جائے

وسیم جبران

غزل

از کراماً کاتبیں ، اچھا بُرا لکھا گیا
ہٹ کے امرِ یار سے فیضانؔ کیا لکھا گیا

اختیار و جبر سے واقف نہیں ہوں دوستو!
میں وہی کرتا رہا جو کچھ کہ تھا لکھا گیا

پہلے میں موجود تھا علمِ خدائے پاک میں
اُس کے موجب بعد میں ہونا مرا لکھا گیا

"کنتُ کنزاً" میں بڑی گہرائی و گیرائی ہے
آئنے میں عکس کو وحدت نما لکھا گیا

اِس سے بڑھ کر شرک ہوگا اور کیا توحید میں
ایک قطرے کو سمندر سے جدا لکھا گیا

یہ مظاہر سب دُوئی کی خانہ بربادی کے ہیں
عین پر نکتہ بڑھا کر غیر سا لکھا گیا

کاتب و مکتوب و کتبہ جب سراپا ایک ہیں
کس لئے پھر کچھ روا کچھ ناروا لکھا گیا

روح کے شیشے میں آیا جسم کے ہاتھوں سے بال
جب وہی وہ ہے تو پھر کیوں دوسرا لکھا گیا

جُو نوشتہ ، ہے بھلا فیضانؔ کیا ہستی مری
جانئے حرفِ غلط ، جو ماسوا لکھا گیا

فیض رسول فیضان

قتیلِ ستم خوردہ

(محمد حسن قتیلؔ کی فارسی غزل کا اردو ترجمہ)

ہمیں مار کر اپنے غمزوں سے اُس نے بہانہ بنایا تو قدر و قضا کا
نہ دیکھا ہماری طرف آپ اُس نے بہانہ بنایا تو شرم و حیا کا

ہماری صدا تھی جسے سن کے وہ مہ جبیں اپنے گھر سے نکل آئی باہر
مگر اُس پری وش کے دستِ کرم نے بہانہ بنایا تو فقرِ گدا کا

وفورِ محبت سے خود غیر کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا اس نازنیں نے
ہمیں جونہی ہی دیکھا ذرا سا پھسل کر بہانہ بنایا تو لغزیدہ پا کا

گیا سوئے مسجد میں اس ماہ رو کے رخِ زیب و زینت کا نظارہ کرنے
مگر اس نے ہاتھوں سے منہ کو چھپا کر بہانہ بنایا تو دستِ دعا کا

حسینوں کا نظارہ کرنے کی جرأت نہ تھی زاہدِ بے ریا کے جگر میں
ٹھکانہ کیا اپنا حجرے میں جا کر بہانہ بنایا تو خوفِ خدا کا

قتیلِ ستم خوردہ کے خوں کی لالی ہے آصف! جسے اُس جفا گر صنم نے
بہت روند کر اپنے پاؤں کے نیچے بہانہ بنایا تو رنگِ حنا کا

مرزا آصف رسول

غزل

اس ایک دکھ کا مداوا نظر نہیں آتا
کہ بھیڑ میں کوئی اپنا نظر نہیں آتا

میں ایسی آنکھوں کو زندہ شمار کیسے کروں
کہ جن کو پھولوں کا کھلنا نظر نہیں آتا

کہاں کی صورتِ احوال پوچھتے ہیں آپ
یہاں تو کچھ پسِ پردہ نظر نہیں آتا

بجھا دیئے ہیں یہ کس نے دیے محبت کے
تری نظر سے تو ایسا نظر نہیں آتا

تمام شہر تماشائی بن گیا ہے کیوں
کہیں ہمیں تو تماشا نظر نہیں آتا

سجے ہوئے ہیں فقط خواب میں حسیں منظر
حقیقتاً کہیں ایسا نظر نہیں آتا

فلک کو گھورتے رہتے ہیں کتنی حسرت سے
کہیں بھی چاند، ستارا نظر نہیں آتا

پلا رہے ہیں بہت شوق سے مجھے اپنے
مگر یہ زہر گوارا، نظر نہیں آتا

میں اس کی باتوں پہ ایمان لا نہیں سکتی
نجف سے جس کو مدینہ نظر نہیں آتا

کسی فریب کی پٹی بندھی ہے آنکھوں پر
تمھیں تو یوں بھی ثمینہ نظر نہیں آتا

ثمینہ سید

غزلیں

غیر سے کیا کریں گلہ بھائی
بھائی ہی جب نہیں رہا بھائی

اک گلی کا بھی فاصلہ نہیں ہے
ہاں! دلوں میں ہے فاصلہ بھائی

رزق تو اس کی دسترس میں ہے
جو کہ ہم سب کا ہے خدا، بھائی

ایک مدت سے دے رہے ہو مجھے
جانے کس جرم کی سزا بھائی

یہ مکافات ہے زمانے میں
کر بھلا گر تو ہو بھلا بھائی

الجھے دھاگوں کا دیکھنا ارشد
یار ملتا نہیں سرا بھائی

ارشد محمود ارشد

آپ مشکل میں سفینے کی طرف دیکھتے ہیں
اور ہم لوگ مدینے کی طرف دیکھتے ہیں

میں نے اس واسطے شجرہ نہیں پوچھا تم سے
دیکھنے والے قرینے کی طرف دیکھتے ہیں

کم شناسوں نے ہے مٹی میں ہمیں رول دیا
جوہری ہوں تو نگینے کی طرف دیکھتے ہیں

وقتِ رخصت کا وہ منظر ہے بسایا دل میں
یاد آتا ہے تو سینے کی طرف دیکھتے ہیں

اس کے آنے کی خبر جب سے سنی ہے ہم نے
دن، گھڑی اور مہینے کی طرف دیکھتے ہیں

وہ کہ مزدور کی اجرت نہیں کھاتے ارشد
لوگ جو بہتے پسینے کی طرف دیکھتے ہیں

غزل

در کی خواہش میں دیوار رکھی گئی
روشنی تھی وہ مسمار رکھی گئی

خواب گاہوں میں دستار روندی گئی
سب نگاہوں میں تلوار رکھی گئی

ہم سے پہلے مسافر کہاں رہ گئے
داستانوں کی بھر مار رکھی گئی

سامراجی عنایت کی خوش خبریاں
قید خانوں میں جھنکار رکھی گئی

زندگی اس قدر خوب صورت کہاں
چاند تاروں میں اے یار رکھی گئی

خاندانِ غلاماں کی مجبوریاں
یہ کہانی بھی مضمار رکھی گئی

عدل کے فیصلے شاہراہوں پہ ہیں
بس دکھاوے کو سرکار رکھی گئی

منقسم غم کی ایسی تھیں دلداریاں
اب حکومت بھی فن کار رکھی گئی

جلد بازی میں آگے قطاریں ملیں
راستوں پہ بھی پھنکار رکھی گئی

ٹیکس کی پرچیاں مفت بٹنے لگیں
ہر مذمت میں دھتکار رکھی گئی

ہم طوافِ غمِ دل کے عادی ہوئے
عادتاً آنکھ دم دار رکھی گئی

سعدیہ بشیر

غزل

ساتھ دینا ہے تو پھر ذہن بنالے اپنا
تو جسے چاہے اُسے ہاتھ دکھالے اپنا

چاندنی رات میں کہتے تھے ستارے اُس کو
وہ بھی مہتاب اندھیرے سے نکالے اپنا

دل چرانے کا اُسے خوب ہنر آتا ہے
وہ جسے چاہے اُسے پل میں بنالے اپنا

میں نے بھی روک کے رکھا ہے اُسے آنکھوں میں
وہ بھی سینے میں کہیں درد سنبھالے اپنا

درد کی رُت میں کہاں ساتھ کوئی چلتا ہے
آئنہ بھی نہ کہیں چہرہ چھپالے اپنا

راستہ روکے کہیں میر، کہیں ہے غالب
کس طرح پھر کوئی اُسلوب نکالے اپنا

اشرف کمال

غزلیں

میں ہوں انکار کی گولی سے ڈرا اندر سے
آپ کے سامنے بزدل ہوں ذرا اندر سے

خود پہ کھل جاؤں تو پھر جا کے جواب آپ کو دوں
میں مہذب ہوں کہ وحشت سے بھرا اندر سے

کتنی آسانی سے کھا سکتا ہوں دنیا سے فریب
جیسا باہر سے ہوں ایسا ہی کھرا اندر سے

مسکراہٹ مرے ہونٹوں پہ کھلی رہتی ہے
کسی موسم میں بھی رہتا ہوں ہرا اندر سے

قہقہہ زن ہوں سرِ شدتِ شمشیرِ ستم
میں جو مر کر بھی نہیں یار مرا اندر سے

مطمئن ہو کے بھی تجھ پیار سے ہوتا نہیں ہوں
دل کی دنیا کی مجھے سیر کرا اندر سے

اک نئے زخم کا سامان کیا ہے جاذبؔ
تب کہیں پہلا مرا گھاؤ بھرا اندر سے

اکرم جاذب

تم نے دیکھا تو روشنی ہوئی تھی
شوخ رنگوں سے دوستی ہوئی تھی

میں زمیں زاد بھول بیٹھا تھا
کہ نظر چاند پر ٹکی ہوئی تھی

چھٹ رہا تھا غبار آنکھوں سے
دھند جذبات پر پڑی ہوئی تھی

لمحے تاریخ کو بدل رہے تھے
اور گھڑی پر نظر رکی ہوئی تھی

دل کے مالک نے گھر کو چھوڑا تھا
آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی

آخری سانس لے رہی تھی آس
زندگی مضمحل کھڑی ہوئی تھی

اس کی تعبیر وسعتیں تھیں سب
مجھ کو حاصل جو بے گھری ہوئی تھی

راہ نفرت نہ پا سکی جاذبؔ
ایسے دل میں مہک بسی ہوئی تھی

غزل

مَیں ، سفر اور رائیگانی کا ملال
بے سبب کی زندگانی کا ملال

پیاس تھی اپنی جگہ مایوس کُن
کربلا تھی اور پانی کا ملال

لامکانوں کے مکاں والے ، ہمیں
ہے تری اِس لامکانی کا ملال

بولنا مشکل نہیں تھا پر مجھے
ہے ابھی تک بے زبانی کا ملال

ہر کہانی کا یہی انجام ہے
اِک جُدائی ہر کہانی کا ملال

ہوتا ہے ساگر کو بھی گہرائی میں
انتہا کی بے کرانی کا ملال

باغ اُجڑا ، پھول بکھرے ، رہ گئے
باغباں اور باغبانی کا ملال

شبہ طراز

غزل

ڈھال کر شعروں میں رودادِ جوانی اپنی
سُونے کمروں میں الاپی ہے کہانی اپنی

اس زمانے میں کہ ہر شخص ہے بدلا بدلا
اِک نیا پن ہے جو خُو بُو ہے پرانی اپنی

ہم کہ باوضع بھی، خوددار بھی، حساس بھی ہیں
سامنے اُس کے کوئی قدر نہ جانی اپنی

ہم کہ خود اپنے ہی ناصح بھی تھے نکتہ چیں بھی
جب تجھے مان لیا ایک نہ مانی اپنی

کچھ تو تھا تھم گئے بہتے ہوئے آنسو ورنہ
پانیوں سے کہیں رُکتی ہے روانی اپنی

چُن کے دو پھول بیادِ دلِ پُرخوں روشنؔ
سونپ دی گیسوئے جاناں کو نشانی اپنی

اعجاز روشن

غزل

عروضی علم کا محرم نہیں ہوں
مگر میں شاعری میں کم نہیں ہوں

تری حالت پہ ہوں میں دل گرفتہ
ترے زخموں کا گو مرہم نہیں ہوں

مجھے ہر بار تو بارِ دگر پڑھ
کسی اخبار کا کالم نہیں ہوں

بظاہر تو مرا ہمدم نہیں ہے
بظاہر میں ترا ہمدم نہیں ہوں

نہ جانے تو ہے کیوں رنجیدہ خاطر
میں تیری ذات پہ برہم نہیں ہوں

ہے میری ذات اک آئینہ خانہ
مثالِ دیدۂ پرنم نہیں ہوں

بہاریں لاؤں گا ہمراہ اپنے
فراق و ہجر کا موسم نہیں ہوں

نہیں یہ مستقل میرا ٹھکانہ
"جہاں بھی ہوں وہاں پیہم نہیں ہوں"

مجھے تو آزما کر دیکھ دانش
سراسر قند ہوں میں سم نہیں ہوں

اعجاز دانش

غزل

پھر کوئی ساعتوں کا چکر ہے
دہر میں حیرتوں کا چکر ہے

وہ کسی کی کبھی نہیں سنتا
آئنہ مخمصوں کا چکر ہے

ہیں میسر سکوت کی شامیں
یہ سبھی فرصتوں کا چکر ہے

منزلوں کو کہیں دوام نہیں
زندگی راستوں کا چکر ہے

عشق رکھا گیا ہے پھر گروی
بندگی سلسلوں کا چکر ہے

لمحہ لمحہ جو دل میں اٹھتے ہیں
آگہی وسوسوں کا چکر ہے

فرقتیں پھر بیان ہوں کیسے
ہجر تو وحشتوں کا چکر ہے

طلعت شبیر

غزل

صحرا میں سائبان ہے سب سے الگ تھلگ
دِل میں کسی کا دھیان ہے سب سے الگ تھلگ

شہزادی ہے، محل ہے، قفس میں غلام ہے
فُرقت کی داستان ہے سب سے الگ تھلگ

لگتا نہیں ہے شہر کے لوگوں میں دِل مِرا
اپنا مِرا جہان ہے سب سے الگ تھلگ

مُجھ تک پہنچ نہ پائی کوئی رابطہ سڑک
کیونکہ مِرا مکان ہے سب سے الگ تھلگ

روزن ہے اور اُس میں ستارہ ہے ایک ہی
چھوٹا سا آسمان ہے سب سے الگ تھلگ

بیٹھا ہے اِک فراق مِری گھات میں جہاں
اِس بَن میں اِک مچان ہے سب سے الگ تھلگ

ہوتے نہیں نصیب جزیرے اُسے کبھی
کُھلتا جو بادبان ہے سب سے الگ تھلگ

لاشے ہیں رزم گاہ میں اعدا کے ہر طرف
ٹُوٹی پڑی کمان ہے سب سے الگ تھلگ

بکھری ہُوئی پلنگ پہ پتیاں ہیں خواب کی
کونے میں شمعدان ہے سب سے الگ تھلگ

بدظن ہیں مُجھ سے لوگ یہاں اور بھی کئی
لیکن وہ بدگمان ہے سب سے الگ تھلگ

ہجراں ہے اور نہ وصل کا امکان ہے کوئی
میرا تو امتحان ہے سب سے الگ تھلگ

پَر جل رہے اور بلندی کا ڈر نہیں
کاشفؔ مِری اُڑان ہے سب سے الگ تھلگ

کاشف رحمان

غزل

تو بھی تو سوچ مرے بارے میں
مر نہ جاؤں میں اس خسارے میں

کل جو دیکھے ہیں دھند میں کہسار
کیسا جادو تھا اس نظارے میں

واجبی خدوخال ہیں لیکن
پھر بھی کچھ خاص ہے تمھارے میں

لوگ ثقلین دیکھتے ہیں چمک
اور روشن ہے آگ تارے میں

کیوں مجھے ہی نظر نہیں آتی
روشنی اب بھی ہے ستارے میں

جس کو دیکھو فریب دیتا ہے
کوئی خامی ہے اس سیارے میں

ثقلین جعفری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ سفر، سَر بہ سَر رائیگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں

غزلیں

منصبِ عشق سے معزول بہت ہوتی ہے
عقل تدبیر میں مشغول بہت ہوتی ہے

کل مرے باپ نے جی بھر کے دعائیں مجھے دیں
اور دعا باپ کی مقبول بہت ہوتی ہے

وہ تو بیتاب ہے کب سے نظر آنے کے لیے
میری آنکھوں میں ہی کچھ دھول بہت ہوتی ہے

سرنگوں ہوتی ہیں سب ٹہنیاں قتلِ گُل پر
باغ میں حرمتِ مقتول بہت ہوتی ہے

عقیل شاہ

نصیب کس طرح اک آن میں بدلتا ہے
تمام فائدہ نقصان میں بدلتا ہے

اُسی سے مانگتا رہتا ہوں دشتِ غربت میں
دعا کو جو سر و سامان میں بدلتا ہے

یہ دیکھنے کو مرے دل میں آ رہے ہیں لوگ
کہ شہر کیسے بیابان میں بدلتا ہے

ہَوا کے دوش پہ ہوتا ہوں رات پچھلے پہر
یہ فرش تختِ سلیمان میں بدلتا ہے

سچ کو سچ کہتا ہے اس دور میں اور جھوٹ کو جھوٹ
دلِ ناداں سے مرے بھول بہت ہوتی ہے

خرچ ہوتی ہے بس اک عمر ہی بدلے میں عقیل
قیمتِ ہجر بھی معقول بہت ہوتی ہے

نجانے کون ہنر مند ہے چھپا مجھ میں
جو میرے درد کو دیوان میں بدلتا ہے

بجھا بجھا نظر آتا ہے کچھ دنوں سے عقیل
اگرچہ پھول وہ گلدان میں بدلتا ہے

غزل

ہم مِل گئے ، ہمارا ستارہ نہیں مِلا
یعنی نصیب سارے کا سارا نہیں مِلا

ڈُوبے بھی ہم تو آ کے کنارے پہ ڈُوبے ہیں
یہ بھی نہیں گِلہ کہ کنارہ نہیں مِلا

پہلے پہل تو ہم نے اِشاروں میں بات کی
پھر یُوں ہُوا کہ ہم کو اِشارہ نہیں مِلا

ہم تو حلال میں بھی منافع نہ پا سکے
اُن کو حرام میں بھی خسارا نہیں مِلا

ہر دم دُکھوں کے ساتھ گزاری ہے زندگی
کیسے کہیں کہ ہم کو سہارا نہیں مِلا

دیکھیں جسے تو دیکھتے گُزرے تمام عُمر
کوشش تو ہم نے کی ، وہ نظارا نہیں مِلا

ہم جیسے بارہا مِلے کیفی ہمیں مگر
تُجھ سا ہمیں کہیں کوئی پیارا نہیں مِلا

محمود کیفی

غزل

اپنی باتوں میں الجھائے رکھتے ہیں
آنکھوں والے خواب دکھائے رکھتے ہیں

آنکھیں بوجھل رہتی ہیں کچھ نیندوں سے
اور نیندوں میں خواب جگائے رکھتے ہیں

اندر باہر آنا جانا ہوتا ہے
دیواروں میں در بنوائے رکھتے ہیں

سب کچھ کھول کے رکھ دیتے ہیں دنیا پر
خود سے اپنا آپ چھپائے رکھتے ہیں

ویرانہ بھی پہلے بستی ہوتا تھا
اب ہم دل کو یوں سمجھائے رکھتے ہیں

لگتا ہے الزام ہمارے جیسوں پر
سر سے وہ چادر سرکائے رکھتے ہیں

برکھا رت کی پسپائی تک ہم عاصمؔ
اشکوں کا پھر بار اٹھائے رکھتے ہیں

عاصم اعجاز

غزل

ریگِ صحرا میں شجر چپ کی زباں بولتا ہے
راستہ بوڑھے مسافر سے کہاں بولتا ہے؟

جب کنارے کے قریں اس کے حسیں آنچل کا
عکس پڑتا ہے تو پھر آبِ رواں بولتا ہے

میں نے دیکھا ہے یہ اعجازِ مسیحائی بھی
پھول کھل اٹھتے ہیں وہ شخص جہاں بولتا ہے

داستانیں ہیں سرِ راہ تری پلکوں کی
تیری آنکھوں کی زباں سارا جہاں بولتا ہے

عقل حیران ہے اس ذوقِ ہنر مندی پر
جس جگہ ہوتا نہیں ہے وہ وہاں بولتا ہے

میں نے دیکھا ہے کئی بار مخاطب کر کے
آگ خاموش ہی رہتی ہے دھواں بولتا ہے

ایک سر کٹنے کے ڈر سے رہا خاموش مگر
ایک سر ہے جو سرِ نوکِ سناں بولتا ہے

تم اگر اب بھی نہ مانو تو تمہاری مرضی
اس کے ہونے کا تو ہر ایک نشاں بولتا ہے

صاف ظاہر ہے کہ تم غور سے سنتے ہی نہیں
میری بستی کا تو ہر ایک مکاں بولتا ہے

علی رضا بلوچ

غزل

ہمارے بیچ بہت کچھ ہے دوستی کے سوا
یہ بات مجھ کو رلانے لگی خوشی کے سوا

کسی کا خواب، کوئی راستہ، کوئی صورت
ہماری آنکھ میں کچھ بھی نہیں نمی کے سوا

نئے زمانے کا مجنوں ہوں اور گھر میں ہوں
یہ دشت کچھ نہیں دیتا ہے تشنگی کے سوا

تمام عمر بھکاری رہے ہیں لفظوں کے
ہمارے کاسے میں کیا ہوگا شاعری کے سوا؟

یہ میرے ساتھ اکیلے میں بات کرتی ہے
کوئی عزیز نہیں مجھ کو خامشی کے سوا

ہمارے پاس صفِ دوستاں تھی پھر بھی علی
یہ کائنات ادھوری لگی کسی کے سوا

علی آرش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

راستہ کھو دیں نہ صحرائے رضا کے قافلے
اے رخِ آفاقِ جاں! وہ نجمِ حرماں کیا ہوا؟

غزل

سفر میں ایسی کوئی رات بھی نہیں آتی
جہاں پہ کام تری ذات بھی نہیں آتی

وہ چاہتی ہے کہ میں اس سے بات کرتا رہوں
خدا گواہ کہ پھر بات بھی نہیں آتی

ترے بغیر فضا سوگوار لگتی ہے
ترے بغیر تو برسات بھی نہیں آتی

ستم نہیں کہ تمہیں فوج کی کماں دے دیں
تمہاری فہم میں جب گھات بھی نہیں آتی

کسی کے حصے میں کون و مکاں کا سرمایہ
کسی کے حصے میں خیرات بھی نہیں آتی

وہ بدنصیب کسے چاہنے لگی انجم
اسے تو رسمِ ملاقات بھی نہیں آتی

امتیاز انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہوا کے دوش پہ اب تک سفر میں ہیں خالد
ہم اپنے شہر سے نکلے تھے، داستاں کی طرح

غزل

نسخۂ درد کی تالیف نہیں ہو سکتی
ہائے اس باب میں تخفیف نہیں ہو سکتی

عدل و انصاف مرا دِیں ہے، لہٰذا مجھ سے
منظرِ ظلم کی تعریف نہیں ہو سکتی

نفرتوں میں کبھی ترمیم تو ہو سکتی ہے
الفتوں میں کبھی تحریف نہیں ہو سکتی

رہنے دیجے یہ وفا، آپ کو معلوم تو ہے
اس قدر آپ سے تکلیف نہیں ہو سکتی

کیوں بھلا آپ جنوں وقفِ قلم کرتے ہیں؟
یہ کتاب آپ سے تصنیف نہیں ہو سکتی

جیا قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک عادت ہے عبادت خالد
کچھ تو پُوجیں گی پجاری آنکھیں

غزل

اب کہاں لوگ پرانے والے
حق کی آواز اٹھانے والے

اپنا احسان بھی کھو دیتے ہیں
اپنا احسان جتانے والے

اُٹھ گئے لوگ یہاں سے کب کے
عشق کا بوجھ اٹھانے والے

سوچ میں رنگ بھریں گے کیسے
سوچ کا رنگ اڑانے والے

اب اُٹھا حشر زمیں پر کوئی
آسماں سر پہ اٹھانے والے

ہوگئے رزق زمیں کا فرخؔ
سوچ کا رزق کمانے والے

فرخ محمود

غزل

جن کو سبق دیا تھا پڑھانے لگے ہمیں
دو اور دو کی جمع بتانے لگے ہمیں

جائیں جو دشت کو تو بُلاتا ہے گھر ہمیں
آئیں جو گھر کو دشت بُلانے لگے ہمیں

پہلو میں اُن کے بیٹھے تو اشعار میرؔ کے
پہلو بدل بدل کے سُنانے لگے ہمیں

غالبؔ کی طرح ہم بھی جو بیٹھے ہیں راہ میں
وہ بھی گدا سمجھ کے اُٹھانے لگے ہمیں

جب دیکھ کر رقیبوں کو جانے لگے تھے ہم
یاروں کا یار کہہ کے بُلانے لگے ہمیں

کشتی اُلٹ گئی جو محبت کی نہر میں
سب ڈوبتے پکڑ کے بچانے لگے ہمیں

عارضؔ پہ اُن کا خالِ سیہ مار کی طرح
کُنڈل جو مارے اور ڈرانے لگے ہمیں

سرفراز عارض

غزل

غلط تھے مشورے سارے جو بھائی دیتا رہا
وہ سانپ تھا مجھے سیڑھی دکھائی دیتا رہا

میں دور جاتی گئی اور فریب کھاتی گئی
وہ شخص مجھ کو مسلسل جدائی دیتا رہا

میں اس کے ظلم و ستم پر نہ کر سکی، اف تک
مگر یہ دل کہ برابر دہائی دیتا رہا

کوئی بھی دوسرا موجود گھر میں تھا ہی نہیں
عجیب شور سا مجھ میں سنائی دیتا رہا

میں کیا کروں کہ عدالت خلاف تھی رفعت
مرا وکیل تو میری صفائی دیتا رہا

رفعت وحید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سبھی آنکھیں ہیں، ہماری آنکھیں
گھل کے بہہ جائیں نہ ساری آنکھیں

غزل

وہ آفتاب جو ہوتا تو ڈھل گیا ہوتا
ہمارے ذہنوں سے کب کا نکل گیا ہوتا

وہ میری آنکھوں میں رہتا ہے روشنی بن کر
وہ اشک ہوتا تو کب کا ٹہل گیا ہوتا

مرا ضمیر اجازت اگر مجھے دیتا
تو اپنی راہیں میں کب کا بدل گیا ہوتا

میں ابتلائے زمانہ ہوں ابتلائے نفس
نہیں تو ہاتھوں میں پتھر پگھل گیا ہوتا

ہے کس میں تابِ نظارا خدا کی بستی میں
اگر میں طور بھی ہوتا تو جل گیا ہوتا

حصار میں ہوں دعاؤں کی آج تک ناصر!
فسوں وگرنہ زمانے کا چل گیا ہوتا

عامر عباس ناصر اعوان

غزلیں

مری حیات میں یہ یادگار باقی ہے
کہ تُو نہیں ہے مگر تیرا پیار باقی ہے

نظارے ڈُوب گئے موسموں کی وحشت میں
وہ اِک چٹان وہ اِک آبشار باقی ہے

نظر سے محو ہوئیں رونقیں محبت کی
یہی بہت ہے دِلِ بے قرار باقی ہے

دمِ فراق فقط اپنے جینے مرنے کا
کسی کی یاد پہ اَب انحصار باقی ہے

گری ہیں بجلیاں سو بار آشیاں پہ مگر
درونِ دِل میں کوئی شاخسار باقی ہے

مجھے بکھرنے نہیں دیتی درد میں قائل
دِل و نظر میں جو اُمیدِ یار باقی ہے

عمر قیاز قائل

کسی بھی طرح اَنا کا زیاں نہیں ہوتا
جو اپنا کرب ہے ہم سے بیاں نہیں ہوتا

دِکھائی دیتا نہیں دِل کا درد چہرے پر
نظر کا داغ جبیں پر عیاں نہیں ہوتا

کبھی زمیں نہیں ہوتی ہمارے پیروں میں
ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہیں ہوتا

یہ معجزے کبھی اچھے دنوں میں ہوتے ہیں
بُرے دِنوں میں کوئی مہرباں نہیں ہوتا

نہ پُوچھ دِل میں جلن سی کہاں نہیں ہوتی
نہ پُوچھ دردِ جُدائی کہاں نہیں ہوتا

زمانہ ہاتھ بٹاتا ہے صِرف خُوشیوں میں
شریکِ غم کبھی قائل جہاں نہیں ہوتا

غزل

جو روح چیر کے رکھ دے غضب اداسی ہے
نجانے کس لیے یہ بے سبب اداسی ہے

بدل کے شہر میں جاؤں تو اب کہاں جاؤں
جہاں بھی جاؤں یہ لگتا ہے سب اداسی ہے

ازل سے ساتھ ہیں میرے ملال کے موسم
مرا حسب ہے اداسی نسب اداسی ہے

ہوا ہے راکھ بدن جل کے اس کی حدت سے
جلا رہی ہے کہ مثل حطب اداسی ہے

کبھی جو ہنس دیے کھل کر تو رو پڑی آنکھیں
مرے لیے تو یہ سمجھو طرب اداسی ہے

اداس چہرا جو دیکھو تو دھیان میں رکھنا
مرے قبیلے میں اک جاں بلب اداسی ہے

تمہارے شہر کا موسم تو کچھ جدا سا ہے
تمہارے شہر میں بھی چھائی اب اداسی ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے مہر کرم چمکایا
پگ پگ دھوپ کا ہُن برسایا

غزل

آنکھ کا زاویہ بدلنا ہے
اب مجھے ذائقہ بدلنا ہے

سیدھے جانا ہے تو اتر جائیں
میں نے اب راستہ بدلنا ہے

آنکھ رکھے گا اپنے رہبر پر
اِس نے اب قافلہ بدلنا ہے

روز اخبار پر نئی تاریخ
کب کوئی واقعہ بدلنا ہے

دو ہی چہرے ہیں میرے قصے میں
ایک سے دوسرا بدلنا ہے

ایک آدم کا وقت بدلا نہیں
اِس لیے اب خدا بدلنا ہے

نہ لکیریں بچیں نہ دستِ دُعا
کب مِرا زائچہ بدلنا ہے؟

آنکھ بدلی ہے دیکھ کر اسکو
دل کو دیکھے بنا بدلنا ہے

کوئے جاناں میں ہوگا گریہ اب
خود کو ایسا نیا بدلنا ہے

عدیل عباس عادل

غزل

گھبراتے ہیں جو پڑھ کے عبارات ہماری
سُن لیں کہ ابھی ہے یہ شروعات ہماری

زندہ ہیں اِسی آس پہ زندان میں ہم بھی
آئے گی کسی دن تو ملاقات ہماری

اِک چُپ سی لگی رہتی ہے کچھ روز سے ایسی
کس روگ سے ملتی ہیں علامات ہماری

خوابوں میں کبھی مِل کے، کبھی یاد میں کھو کر
بس ایسے ہی کٹ جاتی ہے ہر رات ہماری

تکریم میں ہر شخص ہی اُٹھ جائے گا اُس دم
بازار سے گزرے گی جو بارات ہماری

زندہ ہیں اِسی دورِ فتن اور گھٹن میں
کیا اور بھلا ہوں گی کرامات ہماری

جب جاں پہ بنی تھی تو ہی جان بکف تھے
کیا بھول گئے ہو سبھی خدمات ہماری

کچھ ہجر کی صدیاں ہیں تو کچھ وصل کے لمحے
لے جاؤ سمجھ کر یہی سوغات ہماری

بس چشمِ کرم اُس کی جو ہوگی تو ہے بخشش
کم تر ہیں گناہوں سے عبادات ہماری

بے بس بھی تو کر دیتا ہے وہ قادرِ مطلق
ہے یاد دلاتا ہمیں اوقات ہماری

سچ گوئی سے ہم سب کو بنا لیتے ہیں دشمن
چھُٹتی ہی نہیں ہم سے یہ عادات ہماری

مجروح جو کر دے کسی عزت کے بھرم کو
کس کام کی ایسی بھلا خیرات ہماری

ہم آج بنے پھرتے ہیں در در کے بھکاری
ایسی تو نہ ہوتی تھیں روایات ہماری

ہر روز ہی بہتا ہے لہو سچ کا یہاں پر
لے لیں گے ضیا جان یہ صدمات ہماری

سید ضیا حسین

غزل

میں پُرکھوں کا زمانہ چاہتا ہوں
وہی بچپن سہانا چاہتا ہوں

سہولت دو مجھے دیوار کی تم
میں اپنے غم سنانا چاہتا ہوں

کہا کل شب خدا سے بے بسی میں
میں واپس لوٹ جانا چاہتا ہوں

ہواؤں میں پرندے چھوڑ کر میں
وفائیں آزمانا چاہتا ہوں

کسی دن تم چلے آؤ اچانک
میں کھل کر مسکرانا چاہتا ہوں

محبت بانٹ کر دنیا میں ہر سو
اسے جنت بنانا چاہتا ہوں

یہ میری آخری خواہش ہے آقا!
ترے قدموں میں آنا چاہتا ہوں

خودی کا فلسفہ اکمل سنا کر
میں لوگوں کو جگانا چاہتا ہوں

اکمل حنیف

غزل

گاتی ہیں سبھی بلبلیں خوشبو کی زباں سے
شاداب چمن سارا ہے پھولوں کے سماں سے

جینے کی تمنا میں مرا جاتا ہوں کب سے
اے زیست تجھے ڈھونڈ کے لاؤں میں کہاں سے

ہر چیز کو تم اپنی ہی نظروں سے نہ پرکھو
بنتا ہے یقیں جب بھی نکلتا ہے گماں سے

کمزور نہ سمجھو کبھی مخلوقِ خدا کو
ٹکرائے گی چیونٹی بھی کبھی کوہِ گراں سے

تم سمجھو نہ، مانو نہ مگر جانتے ہو سب
جو زخم مرے دل میں ہیں، آتے ہیں جہاں سے

تم دل کو ٹٹولو تو پڑا ہو گا کہیں پر
یہ پیار کا جذبہ نہیں ملتا ہے دکاں سے

دنیا میں شہابؔ اُس کا مقدر ہے ترقی
باہر جو نکل آتا ہے ہر سود و زیاں سے

شہاب اللہ شہاب

غزل

ہیں مکاں کے نہ لامکاں کے ہیں
ہم سے آوارگاں کہاں کے ہیں

حسن کے چشمے پھوٹتے ہیں یہاں
چاند چہرے سبھی یہاں کے ہیں

لوگوں میں دھوپ بانٹتے آئے
اور امیں ٹھہرے سائباں کے ہیں

ناؤ کو ڈوبنا ہے کہ اعصاب
یوں بھی کمزور بادباں کے ہیں

کوئی بحران سر اٹھائے گا
آگے کے دن بڑے زیاں کے ہیں

دیکھ کمبخت عشق کا افسوں
ہونٹ نیلے ترے جواں کے ہیں

تم کسی دوسرے افق کی ہو
ہم کسی اور کہکشاں کے ہیں

اپنی مٹی کا رنگ ہے ہم پر
ہر حوالے سے ہم یہاں کے ہیں

وقت پڑنے پہ کام آئیں گے
سارے رشتے ہی اس گماں کے ہیں

یہ جو ہم وحشیوں سے لگتے ہیں
ایک وحشت زدہ مکاں کے ہیں

جیسے بھاری دوا لی ہو احمد
ایسے کچھ ذائقے زباں کے ہیں

احمد محسود

غزل

جب تری ثِقل سے میں بری ہو گیا
زندگی کا سفر ملتوی ہو گیا

خواب کا ذائقہ تھوکنے پر کھلا
خطۂ چشم کیوں دلدلی ہو گیا

مجھ اندھیرے کی تاثیر منفی نہیں
روشنی نے چھوا ، ملگجی ہو گیا

ختم ہوتا گیا جب زمیں کا نمک
آسماں کا بدن گندمی ہو گیا

ایک تصویر میں نے سرہانے رکھی
سارا کمرا مرا شبنمی ہو گیا

مجھ کو مذہب کی تفریق راس آ گئی
میں پھر انسان سے آدمی ہو گیا

آمد و رفت ہے ایک احساس کی
داخلی ہوگیا ، خارجی ہو گیا

دو عزادار آنکھوں نے مجلس پڑھی
دل کا ماحول گل ماتمی ہو گیا

کربلا کے معانی سمجھ آ گئے
میرا احساس جب فاطمی ہو گیا

ایک درویش کی بد دعا کیا لگی
شہر کا شہر ہی رتجگی ہو گیا

سارے موسم تاثر بدلتے گئے
اک تعلق جو بے موسمی ہو گیا

گُل جہان

غزل

مدتوں سے جمی برف کے جونہی تودے پگھلنے لگے
گہرے نمکین پانی جہازوں کے پیندے نگلنے لگے

میں کہیں بیٹھ کر بیتے لمحوں کو تسبیح کرتا رہا
اور آنکھوں کی تہہ میں چھپے رنگ پرتیں بدلنے لگے

تیز آندھی کسی موج میں میرے آثار کو چھو گئی
اور کسی عہد کے کتنے متروک معبد نکلنے لگے

میں زمانے کے کرّوں سے اس پار تھا اور خاموش تھا
میں نے ان کے بھی حصے کا گایا تو وہ ساتھ چلنے لگے

وقت کی لے مرے ساتھ ہم رقص تھی اور بغل گیر تھی
پھر بھی سرمدی نغمے آزردہ سازوں میں ڈھلنے لگے

اپنے ہمسائے میں چوڑیوں کے چھنکنے کی آواز تھی
کھڑکیاں بند کیں ہم نے کمرے میں تنہا ٹہلنے لگے

میں پلٹ آیا ہوں خشک ہوتے ہوئے ساحلوں کی طرف
اب مجھے اس سے کیا پتھروں سے بھی چشمے ابلنے لگے

قاسم حیات

غزل

پائی ہے رمزِ زندگی ہم نے
جب سے کر لی ہے عاشقی ہم نے

پھر رہے ہیں چراغِ دل لے کر
دور کی کچھ تو تیرگی ہم نے

اب کسی دشمنی کا خوف نہیں
خوب دیکھی ہے دوستی ہم نے

گم تھے جو گردشِ حوادث میں
کس نے کی ان کی رہبری؟ ہم نے

بڑھ گئی اور تشنگی محسن
لی جو اب لب سے تازگی ہم نے

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کان سے دل تک آنے والی راہ میں گرد نہیں اڑتی
ظلم کی بات سفر کرتی ہے، گھر گھر سچ سچ جاتی ہے

غزلیں

اپنی جانب اسے لانے میں بہت وقت لگا
اک حسیں خواب دکھانے میں بہت وقت لگا

یہ خدوخال یہ رُخ اور یہ دلکش چہرہ
تیری تصویر بنانے میں بہت وقت لگا

ایک عرصے سے روانہ تھا میں اپنی جانب
خود سے خود تک مجھے آنے میں بہت وقت لگا

تیری صورت تری آواز تو میں بھول گیا
تیری آنکھوں کو بھلانے میں بہت وقت لگا

شعبدہ باز تماشے میں ہنر کھو بیٹھا
پھر تماشائی ہنسانے میں بہت وقت لگا

مزمل ادریس

تمہارے دل کو محبت سے خوش گمانیاں ہیں
کوئی کسی کا نہیں ہے یہ سب کہانیاں ہیں

تری یہ روح ہماری ہے ٹھیک ہے لیکن
وہ جن کے پاس ترے جسم کی نشانیاں ہیں؟

کسی کے ساتھ تعلق نہیں رہا میرا
یہ تیرے ساتھ تعلق کی مہربانیاں ہیں

نہ تم رہے نہ تمہاری کشش رہی پھر بھی
ہمارے شعر میں کس واسطے روانیاں ہیں

بہار رت میں اکیلے ہیں دیوتا میرے
خدایا خیر ہو جیسی وہاں جوانیاں ہیں

بچھڑ چکا ہوں میں لیکن وہ اس گمان میں ہے
ہمارے درمیاں تھوڑی سی بدگمانیاں ہیں

حسیب الحسن

غزل

بھول ہی جائے گی ہر بات، چلو سو جائیں
بیت ہی جائے گی یہ رات، چلو سو جائیں

کب تلک جاگ کے کرنا ہے کسی بات کا غم
اشک بن جائیں نہ برسات، چلو سو جائیں

دل سے نکلی تھی جو اک ایک دعا دونوں کے
ساتھ رکھتے ہیں وہ دن رات، چلو سو جائیں

ہر ملاقات پہ مسرور رہیں دل والے
جائے خالی نہ کوئی گھات، چلو سو جائیں

دے کے ہستی جو خریدا تھا کبھی، ہم نے گل!
لے کے اس درد کی سوغات، چلو سو جائیں

کوکی گل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ مجھے بھی ہلاک کر دے گا
قرب، دریائے تابکاری کا

غزلیں

اپنا آپ چھلک جائے گا ڈرتا ہوں
جب میں اسکے خالی پن کو بھرتا ہوں

جس کو موت کے نام سے بھی ڈر لگتا ہے
میں اک ایسی دوشیزہ پہ مرتا ہوں

اپنے آپ سے کہتا ہوں "کل ملتے ہیں"
اور مقرر وقت پہ آپ مکرتا ہوں

ہمسائے کی بیل نے بور اٹھایا ہے
اب میں پتھر روز اکٹھے کرتا ہوں

مجھ صحرائی مٹی کی تنظیم نہ کر
میں ترتیب میں آ کر اور بکھرتا ہوں

پھول سمجھ لیتے ہیں دل کا حال منیر
میں تو ان پھولوں سے باتیں کرتا ہوں

منیر جعفری

کس کس کو نیرِ آب ہوا کی تلاش ہے؟
کہتا ہے ہر حباب، ہوا کی تلاش ہے

اس واسطے بگاڑ رہا ہوں غزل کو میں
احساس کو خراب ہوا کی تلاش ہے

سر پر پڑی ہوئی ہیں زمانے کی سختیاں
اس گرد کو جناب ہوا کی تلاش ہے

ہر سطرِ زندگی پہ ہے لکھا ہوا گھٹن
میرا سبھی نصاب ہوا کی تلاش ہے

دانیال احمد زمان

غزل

صحیفہ پڑھ رہا ہوں بے بسی کا
تعاقب کر رہا ہوں تیرگی کا

اُٹھو یارو جہانِ کُن فکاں میں
بڑھائیں اور رتبہ آدمی کا

مرے سر کو رکھو شانے پہ کچھ دیر
ہو کم دورانیہ آشفتگی کا

تمہاری سمت کیسے لوٹ آؤں
ارادہ ہی نہیں ہے واپسی کا

ہمارے بخت میں لکھا نہیں ہے
کوئی لمحہ زمانے نے خوشی کا

یہ کیسی خواہشِ ناکام ہے جو
مجھے ہونے نہیں دیتی کسی کا

عدنؔ اعصاب پر طاری جنوں کو
بنانا مسئلہ مت زندگی کا

شعیب عدن

غزل

صحبتِ عطر میں سرشار ہوا چاہتی ہے
اور کیا گل سے بھلا بادِ صبا چاہتی ہے

روز ہوتا ہے کوئی واقعہ ان ہونا سا
روز اک تازہ خبر خلقِ خدا چاہتی ہے

جانے تاریخ کو تکرار سے رغبت کیوں ہے
ایسا لگتا ہے کہ پھر کرب و بلا چاہتی ہے

کچھ زماں اور مکاں بھی ہیں ستم آمادہ
کچھ طبیعت بھی کھلی آب و ہوا چاہتی ہے

جسم کا کیا ہے، فنا ہو کے رہے گا آخر
روح تو خیر، مقاماتِ بقا چاہتی ہے

ایک جگنو کی شہادت سے مجھے علم ہوا
رات ہر حال میں ظلمت کی قبا چاہتی ہے

یہ غزل حاصلِ وجدان ہے ورنہ قمروش
شاعری خونِ جگر، فکرِ رسا چاہتی ہے

قمروش عاطر عظیمی

غزل

رکھتا وہ کس طرح خبر اپنے مکین کی
دل کو تو ہوش ہی نہ تھی دنیا و دین کی

آنچل کو جیسے پھینک کے کیکر پہ کھینچ لے
ایسے اڑائیں دھجیاں میرے یقین کی

بے چین ہو کے چل پڑے ہم آسماں کی سمت
ہم کو تو گود راس نہ آئی زمین کی

کتنے ہی سانپ اس میں بسیرا کیے رہے
دیکھو کشادگی تو ذرا آستین کی

اک عمر سے ہے دل مرا خالی پڑا ہوا
دیکھی نہ اس مکان نے صورت مکین کی

ان سے نباہ اس لیے شفقت نہ ہو سکا
ان کو طلب تھی اور کسی مہ جبین کی

شفقت حیات شفق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دیوانِ خالد پڑھے گا یہاں
ہم نوا کیا، کہ اب ہم زباں بھی نہیں

غزلیں

ہو دن کہ رات تری بات کرتے پھرتے ہیں
فقیر یوں بسر اوقات کرتے پھرتے ہیں

یہی سُنا ہے وہ ہنس ہنس کے میرے لوگوں سے
زمانے بھر کی شکایات کرتے پھرتے ہیں

جہاں نظر کی وہیں پھول لہلہا اُٹھے
حسین لوگ کرامات کرتے پھرتے ہیں

کبھی حرم میں کبھی میکدے میں ہوتے ہیں
علاجِ گردشِ حالات کرتے پھرتے ہیں

سُنا ہے آپ بڑے رحم سے متاعِ ستم
فقیر لوگوں میں خیرات کرتے پھرتے ہیں

ردا حاصل خلوص

تارے گننے کے زمانے اب کہاں؟
عاشقی کے وہ ترانے اب کہاں؟

آنکھوں آنکھوں میں جو ہوتے تھے کبھی
ہیر رانجھے کے نشانے اب کہاں؟

کون مرتا ہے کسی کے واسطے
لیلیٰ مجنوں کے فسانے اب کہاں؟

سامنے آ جائے یوسف اور بس
وہ زلیخا کے بہانے اب کہاں؟

وہ نہ دریا اور نہ گہری چاہتیں
سوہنی اور ماہی دِوانے اب کہاں؟

جاؤ جاؤ عاشقِ خانم، کہ وہ
بولے پن کے سب زمانے اب کہاں؟

کون چیرے گا پہاڑوں کے جگر؟
تیشۂ فرہاد جانے اب کہاں؟

فریدہ خانم

غزل

اس شاعری سے خاص سہولت ملی مجھے
لفظوں میں درد کہنے سے راحت ملی مجھے

یادِ نبیؐ سے خوب منور ہوا ہے دِل
سجدے میں سر تھا، رات، زیارت ملی مجھے

یادِ غمِ حسینؓ میں آنکھوں کو تر کیا
ایسے لگا سکون کی دولت ملی مجھے

حشمت مجھے جہان کی ذرّے سے کم لگے
قدموں میں جب سے اُن کے سکونت ملی مجھے

سایہ غموں کی دھوپ پہ آنچل نے کر دیا
عزت جہاں میں ماں کی بدولت ملی مجھے

یہ خط، کتابیں یار مرے دوست بن گئے
کچھ اس طرح سے لکھنے کی رغبت ملی مجھے

شاہد سمجھتا خود کو بڑا خوش نصیب ہوں
کچھ اچھے دوستوں کی رفاقت ملی مجھے

رانا محمد شاہد

غزل

مجھ کو مجھ سا وہاں ملا ہی نہیں
دشت میں کوئی پیڑ تھا ہی نہیں

مدتوں بعد جب ملا وہ مجھے
یوں لگا جیسے آشنا ہی نہیں

میں نے ہر رنگ آزمایا ہے
تجھ سا چہرہ مگر بنا ہی نہیں

میں نہیں جانتا کہاں ہوں میں
اِن دنوں خود سے رابطہ ہی نہیں

آدمی کس طرح جیے گا مہر
چاند پر پھول تو کھلا ہی نہیں

مہر علی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک چھب تھی کہ نگاہوں میں گھلی جاتی تھی
غرقِ دریائے انا ، ماہِ انا اپنا تھا

غزل

خود کو کھونا چاہتا ہوں
تیرا ہونا چاہتا ہوں

سونا بن کر خاک رہا
مٹی ہونا چاہتا ہوں

ہاتھ کپاس ہیں لیکن میں
ریشم بونا چاہتا ہوں

سب کچھ یکدم کھو جائے
جادو ٹونا چاہتا ہوں

اک کہسار کی چاہت میں
اونچا ہونا چاہتا ہوں

جتنا جاگا جاگ لیا
اب میں سونا چاہتا ہوں

جاگتے میں سب دیکھتے ہیں
نیند میں رونا چاہتا ہوں

اعجاز رضوی

عراق کی کھجور

لمیعہ عباس عمارہ عراق میں پیدا ہوئی۔ سن ولادت 1929 ہے۔ بغداد کے قدیمی و تاریخی محلے میں اس کی پرورش ہوئی۔ اس کا باپ عراقی شہر عمارہ کا باسی تھا۔ اس کا خاندان سونے کے زیورات بناتا تھا۔ اس کا چچا بغداد کا معروف سونے کا سوداگر تھا۔ بغداد سے اس نے میٹرک کیا۔ 1950 میں ایجوکیشن کالج بغداد سے بیچلر ڈگری حاصل کی اور اسی کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئی۔ 1963 سے 1975 تک لمیعہ انجمن عراقی مصنفین کی سیکرٹری رہی۔ 1973 سے 1975 تک Unesco عراق کی ڈائریکٹر رہی۔ یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی بغداد کے شعبہ فن و ثقافت کی صدر رہی۔ 1978 میں صدام حسین کے دور حکومت میں یہ امریکہ ہجرت کر گئی۔ امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شہر سان ڈیگو میں سکونت اختیار کی۔ اپنی کل زندگی کا زیادہ حصہ یہیں بسر کیا۔ بالآخر 92 سال کی عمر میں 18 جون 2021 میں اسی شہر میں اس نے وفات پائی۔

لندن سے شائع ہونے والا عربی زبان کا سب سے بڑا اور معتبر اخبار روزنامہ الشرق الاوسط نے 19 جون 2021 کی اشاعت میں لمیعہ عباس کی زندگی اور شاعری پر خصوصی تحقیقی مضمون شائع کیا۔ اس کے مطابق یہ عراقی شاعری میں رومانس کی ایک منفرد اور تیز آواز تھی۔ عربی زبان و ثقافت سے محبت رکھتی تھی۔ اس کا دور عراقی شاعری کا سنہری دور ہے۔ اس نے روایتی شاعری بھی کی اور آزاد شاعری بھی۔ اس نے اپنی دوست نازک ملائکہ کی آزاد شاعری کی تشکیل میں بھرپور حمایت کی۔

بچپن سے ہی لمیعہ عباس عمارہ نے شعر کہنے شروع کر دیئے۔ اپنے باپ کے دوست، لبنانی شاعر ایلیا ابو ماضی کو یہ اپنی شاعری اصلاح کے لیے بھیجتی تھی۔ 1944 میں ادبی رسالہ ''سمیر'' میں اس کا پہلا قصیدہ چھپا۔ اس وقت اس کی عمر 14 برس تھی۔ اس کی اس ابتدائی شاعری پر ایلیا ابو ماضی نے لکھا ''اگر اس طرح کی اعلیٰ شاعری عراقی بچے کر رہے ہیں تو عراق

ترجمہ: محمد احمد

میں ایک نیا شعری انقلاب آنے والا ہے۔" شاعرہ کے شعری مجموعے درج ذیل ہیں:

1- ویران آستانہ، یہ اس کا شعری مجموعہ 1960 میں چھپا۔

2- بہار کی واپسی، یہ اس کا شعری مجموعہ 1963 میں چھپا۔

3- عشتار کے گیت، یہ اس کا شعری مجموعہ 1969 میں چھپا۔

4- اس کا نام محبت ہے، یہ اس کا شعری مجموعہ 1972 میں چھپا۔

5- کاش نجومی مجھے بتا دیتا، یہ اس کا شعری مجموعہ 1980 میں چھپا۔

6- آخری جدائی، یہ اس کا شعری مجموعہ 1987 میں چھپا۔

اس کے کچھ شعری مجموعوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی ہوا، جن میں سرفہرست "کاش نجومی مجھے بتا دیتا" ہے۔ لمیعہ کے دو دیوان ہیں۔ ایک فصیح عربی زبان میں اور دوسرا عراق کے مقامی لہجے میں۔ بین الاقوامی فصیح عربی شاعری اور عراق کی مقامی عربی شاعری، دونوں میں اس نے جدت پیدا کی۔ یہ جدید عربی شاعری اور عراقی شاعری کی سرخیل ہے۔ ناقدین نے اس کو کئی القابات دیئے مثلاً عراق کی کھجور، کانٹوں پر چلنے والی، محفل کی ملکہ اور زبان کی ملکہ۔ یہ مضبوط شخصیت کی مالک تھی۔ اپنی جوانی میں بے حد خوبصورت تھی۔ یہ ان دوشیزاؤں میں سے تھی جن سے محبت کی جاتی ہے۔ یہ سیاہ چادر اور گلے میں قیمتی ہیروں کا ہار پہنتی تھی۔ اپنی خوبصورتی کا ذکر اس نے اپنی شاعری میں بھی کیا۔ اس نے خوبصورتی کی پانچ دہائیاں دیکھیں۔ مشہور عراقی شاعر عبدالرزاق عبدالواحد کی یہ خالہ کی بیٹی ہے۔

لمیعہ عباس عمارہ بیروت سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میری روح بیروت میں کاشت ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ اس شہر میں رہی۔ یہاں بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے دوستی رہی۔ معروف عرب گائیکہ فیروز سے بھی اس کی دوستی تھی۔ لمیعہ بیروت میں شعروادب کی محفلیں خوب سجاتی تھی۔ اسی شہر میں اس کے دو شعری مجموعے چھپے۔ اس شہر کو اپنی پوری کائنات جانتی تھی۔ کہتی تھی کہ میرا سب کچھ بیروت ہے۔ حکومت لبنان نے اپنے ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام لمیعہ عباس عمارہ کو عطا کیا لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ عمر کے آخری حصے میں گوشہ نشین ہو گئی۔ عالمی الیکٹرانک میڈیا و

پرنٹ میڈیا نے اس کی وفات کی خبر کو بڑے ادب و احترام اور اہتمام سے نشر و شائع کیا۔ عراقی حکومت اور وزراء نے تعزیتی پیغامات جاری کیے۔ عراقی ادیب عقیل عباس کہتا ہے، "لمیعہ عباس عمارہ نے عراقی شاعری میں انقلاب برپا کر دیا۔ کیونکہ اس نے اپنی شاعری میں آزادی کے مفہوم پر توجہ مرکوز کی باوجود اس کے کہ وہ مونث آواز تھی۔" شاعرہ کی دوست عراقی ناول نگار ہدیہ حسین کہتی ہے: "یہ عام شاعرات کی طرح شاعرہ نہیں بلکہ اس نے ہماری آنکھیں کتابوں کے صفحات میں سے ایک وسیع زندگی کی طرف کھولی ہیں۔ اس نے ہمیں شاعری سے عشق کرنا سکھایا۔ اب ہم شاعری کو ایک مختلف احساس کے ساتھ پڑھتے ہیں۔"

عرب شاعر بدر شاکر سیاب التونی 1964 کے ساتھ شاعرہ کے محبت کے مراسم رہے۔ دونوں کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ اپنے بہت سے قصیدے اس نے بدر کے نام کیے۔ اپنا قصیدہ "شہر زاد" بھی اسی کے نام کیا۔ اس میں سے چند شعر دیکھیے:

رہیں گے رہیں گے میرے ہونٹ پیاسے
میری آنکھوں میں وہ محفل رہے گی
یہ محبت دل سے الگ نہ ہوگی
اور مایوسی ہر امید کو خاموش نہ کرے گی

☆

ایک اور قصیدے میں بدر کو کہتی ہے:

جس دن میں نے آپ سے محبت کی، میں
نے اپنی آنکھیں بند کر لیں
میں اپنے دین کو نہ جانتی تھی
ہم دونوں نے جانا، ہم دونوں جدا ہوئے، دو آنسو
دو عاشق مر گئے اور چالیس برس کے بھی نہ تھے

.....

لمیعہ اپنی ماں کو بہت یاد کرتی تھی کیونکہ اس نے اپنی بیٹی کو مشکلات میں ڈٹ جانا اور ثابت قدم رہنا سکھایا۔ اپنی ماں کے بارے میں اس کا ایک شعر دیکھیے:

میری ماں کو سلام جس نے مجھے سختی سے سکھایا
کہ میں کانٹوں پر کیسے چلوں؟

دنیا کے ساحل پر اکیلی

اپنے کمرے میں، میں محبت کی کہانی بیان کرتی ہوں
اور محبت کو میں نے ہاتھ تک نہیں لگایا
جیسے فلسفی شراب کی خوبیاں بیان کرتا ہے
لیکن اس نے اس کو چھوا تک نہیں ہوتا

.....

آزاد شاعری میں کہے گئے اس کے مشہور اشعار دیکھیے:

اے میرے دوست! مجھے آپ سے ایک
رات کی ضرورت ہے

یہ رات میری روح اور میرے لیے طاقتور گھوڑا ہے
ٹھنڈ کے جھونکے
میری پسلیوں کو انھوں نے توڑ دیا ہے
میں اس بھول جانیوالی زبان سے آزاد ہوتی ہوں
میرا جسم عشق کو برداشت نہیں کرتا

.....

مئی 2019 میں اس نے یہ اشعار کہے:

شام کیوں پڑاؤ ڈالتی ہے؟
میری گرم نظروں پر غمگین ہو کر
اور نزدیک سے تو اور زیادہ بھلی لگتی ہے
اور میں اکثر اس کا گمان رکھتی ہوں
کہ میں محبت کا پرندہ ہوں

میں عراقی خاتون ہوں

کیا تم سگریٹ پیتی ہو؟
نہیں
کیا تم شراب پیتی ہو؟
کیا تم رقص کرتی ہو؟
نہیں
تم نے اتنے "نہیں" کیوں اکٹھے کر لیے؟
پس اس نے کہا: میں عراقی خاتون ہوں

کاش نجومی مجھے بتا دیتا

کاش نجومی مجھے بتا دیتا
کہ تو ایک دن میرا دوست بن جائے گا
تو میں کسی آدمی کے لیے غزل نہ لکھتی
میں گونگی ہو جاتی
تا کہ تو میرا دوست بن جائے
کاش نجومی مجھے بتا دیا
میں روشن چاند کے چہرے کو نہ چھوتی
میں ندی کی کنکریوں سے نہ کھیلتی
میں اپنی خواہشات کے موتیوں سے نظم نہ لکھتی
کاش نجومی مجھے بتا دیا
کہ میرا دوست
یاقوت کے گھوڑے پر بادشاہ بن کر سوار ہوگا
دنیا نے مجھ پر اپنی سختیوں اور دکھوں کے
ساتھ سختی کی
میں یہ خواب نہ دیکھتی کہ میں مر جاؤں گی
کاش نجومی مجھے بتا دیا
کہ میرا دوست برفانی رات میں
اپنے ہاتھوں میں سورج لے کر میرے پاس آئے گا
میرے پھیپھڑے منجمد نہ ہوتے
گزرے ہوئے غم میری آنکھوں میں بڑے نہ ہوتے
کاش نجومی مجھے بتا دیا
میں جلد ہی آپ سے ملوں گی
اس بھول بھلیوں کے ساتھ
دنیا میں میرے لیے کچھ نہ رہے گا
میں اپنے آنسو اکٹھے کروں گی
سب آنسو
اس دن کے لیے جس دن تو مجھے چھوڑ دے گا

☆☆☆☆☆☆

قسمت والی [کہانی امرتا پریتم]

بہت ہی پیاری تندوری روٹی تھی اور وہ بھی سبزی کی تری سے چھوئی ہوئی لیکن پھر بھی منہ سے نہیں لگائی جاتی تھی۔

''اتنی مرچیں---'' میں اور میرے دونوں بچے سی سی کر اٹھے''

''یہاں بی بی دیہاتوں کا راستہ بہت ہے۔ دارو کی دکان بھی یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ جب دیہاتی ایک گھونٹ دارو پی لیتے ہیں تو پھر مرچوں والا نمکین کھانا مانگتے ہیں' تندور والا کہہ رہا تھا۔

''یہاں---- دیہاتی''

''ہاں بی بی دارو تو سارے ہی پیتے ہیں لیکن جب وہ کوئی انسان قتل کر کے آتے ہیں تو کچھ زیادہ ہی پیتے ہیں۔''

''یہاں پر اس طرح کی وارداتیں----''

''ابھی تر پرسوں کوئی پانچ مرد آ گئے۔ وہ ایک بندہ مار کے آئے تھے۔ ان کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ اکھاڑ پچھاڑ پر شروع ہو گئے۔ وہ دیکھیں میری تین کرسیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ خدا بھلا کرے پولیس کا کہ وہ جلد ہی ان کو پکڑ کر لے گئی۔ ورنہ تو میرے چولہے کی اینٹیں بھی نہ بچتی--- لیکن کمائی بھی تو ہم نے ان کی کھائی ہے۔''

کوشلیا ندی دیکھنے کا خبط مجھے اس دن ہوا جب چنڈی گڑھ سے گھومتے ہوئے وہ گاؤں لے گیا تھا۔ لیکن مرچوں سے شروع ہونے والی بات دارو تک پہنچ گئی اور دارو سے خون خرابے تک اور میں اس گاؤں سے بچیوں کو لیکر جلدی جلدی واپس روانہ ہو گئی۔

تندور اچھی طرح لیپ کیا ہوا اور اندر سے کھلا تھا۔ اور اندر کی جانب ایک طرف چھ' سات خالی بوریاں تان کے پردہ بنایا گیا تھا اور اس کے پیچھے ٹوٹی ہوئی چارپائیوں کے پائے نظر آتے تھے کہ تندور والے کے بچے وہاں پر رہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہاں کوئی ایسا بھی خطرہ نہیں' یہاں پر رہائش بھی اچھی ہے اور وہ بھی باعزت۔

کسی عورت کے ہاتھ نے ٹاٹ کا کونہ اٹھایا' باہر کی طرف جھانکا' ایک بار پھر جھانکا اور

مترجم: حمزہ حسن شیخ

پھر باہر نکل کر میرے پاس ٹھہر گئی۔
"بی بی آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"
"نہیں تو۔"
وہ ایک سادہ سی اور جوان سی لڑکی تھی۔ میں اس کے منہ کو تکتی رہی مگر کوئی بات بھی دماغ میں نہ آئی۔
"میں نے آپ کو پہچان لیا ہے بی بی۔"
"پچھلے سال یا اس سے پچھلے سال تو یہاں پہ آئی تھی۔"
"ہاں جی آئی تھی۔"
"سامنے میدان میں ایک برات ٹھہری تھی۔"
"ہاں۔ یہ تو مجھے بھی یاد ہے۔"
"وہاں پر تم نے مجھے ڈولی میں ایک روپیہ دیا تھا۔"
بات یاد آ گئی۔ دو سال ہوئے میں چنڈی گڑھ گئی تھی۔ وہاں پر نیا ریڈیو کھلا تھا اور مجھے اپنے دہلی کے دفتر والوں نے وہاں پر ایک نظم پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔ موہن سنگھ اور ہندی کے کچھ شاعر جالندھر سٹیشن سے آئے تھے۔ مشاعرہ جلد ختم ہو گیا تھا۔ اور ہم تین چار لکھاری کوشلیا ندی دیکھنے کے لیے چنڈی گڑھ سے اس گاؤں آ گئے تھے۔
ندی کوئی میل ڈیڑھ کی اترائی میں تھی اور واپسی پر چڑھائی چڑھتے ہوئے ہم ایک گرم چائے کے پیالے کے لیے ترس گئے تھے۔ سب سے صاف ستھری اور کھلی دکان یہی تھی۔ یہاں پر ہم نے چائے کا ایک ایک گرم پیالہ پیا تھا۔ اس دن اس دکان پر گوشت اور تندوری روٹیوں کے ساتھ ساتھ مٹھائی کا بھی خاصا رش تھا۔ تندور والا کہہ رہا تھا' "آج یہاں سے ایک برات کا گزر ہوا ہے اس لیے میری اچھی خاصی روزی ہو گئی۔۔۔"
پھر سامنے میدان میں ایک برات ٹھہر گئی جو پچھلے کسی گاؤں سے آئی تھی۔ اسے آگے جانا تھا مگر راستے میں اسے ماموں نے شاید دعوت دی تھی۔
"شادی بھی عجیب چیز ہے۔ آتی کس رنگ میں ہے اور جاتی۔۔۔"
ہم میں سے کسی نے کہا تھا اور چائے کے گھونٹوں کے ساتھ' رنگ کی فلاسفی بھی گرم ہو گئی تھی۔
"ٹھہرو' میں نئی دلہن کا منہ دیکھ آؤں۔۔۔ بھلا اس کے منہ پر آج کیسا رنگ ہے۔۔۔"
مجھے یاد ہے میں نے کہا تھا اور میرے ساتھیوں نے مجھے جواب دیا تھا۔ "ہمیں تو کسی نے ڈولی کے قریب نہیں جانے دینا۔ آپ دیکھ آئیں۔ مگر خالی ہاتھ مت دیکھنا۔"
میں ہنستی ہنسی ڈولی کے پاس چلی گئی تھی۔ ڈولی کا پردہ ایک طرف اٹھا ہوا تھا۔ میں نے پاس بیٹھی نائن سے پوچھا تھا۔ "میں دلہن کا منہ دیکھ لوں؟"
"بی بی صدقے جاؤں۔۔۔ دیکھ لیں۔ ہماری دلہن دیکھنے سے میلی تھوڑی ہوتی ہے۔"

اور سچ مچ دُلہن کا سنگھار، نتھ سجے مسکراتے چہرے کے ساتھ موتی کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کا رنگ تر و تازہ تھا۔

میں نے ایک روپیہ اس کی مٹھی پر رکھ دیا اور جب مڑی تو میرے ساتھی کہنے لگے "کچھ دیر پہلے جب تم نے نظم پڑھی تھی تو کالج کی لڑکیاں ایک روپے کے نوٹ پر تم سے آٹو گراف لے رہی تھیں۔ لیکن اس بیچاری کو تو معلوم ہی نہیں کہ یہ روپیہ اس کو کس نے دیا ہے۔ اگر یہ بھی جانتی تو دستخط کروا لیتی۔۔۔"

یہ تو پچھلے سال کی ہی بات ہے اور پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔

"تم۔۔۔ وہ ڈولی والی دُلہن؟"

"ہاں بی بی"

معلوم نہیں کن حادثوں نے اتنے کم عرصہ میں اسے دُلہن سے ایسا بنا دیا تھا۔ حادثے کے اثرات ان کے چہرے پر واضح تھے۔ لیکن مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں اس سے کس طرح پوچھوں۔

"بی بی! میں نے آپ کی تصویر اخبار میں دیکھی تھی۔ ایک بار نہیں بلکہ دو بار۔ یہاں پر کئی لوگ آتے ہیں جن کے پاس اخبار ہوتی ہے۔ کچھ اس پر روٹی کھاتے ہیں اور اخبار یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔"

"سچی تم نے مجھے پہچان لیا تھا۔"

"ہاں میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ مگر بی بی وہ آپ کی تصویر کیوں چھاپتے ہیں؟"

میں جلدی جلدی جواب نہ دے سکی۔ اس طرح کا سوال پہلے کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ کچھ سوچ کے میں نے کہا "میں نظمیں اور کہانیاں لکھتی ہوں ناں۔۔۔"

"کہانیاں؟ بھلا بی بی وہ کہانیاں سچی ہوتیں ہیں کہ جھوٹی۔۔۔؟"

"کہانیاں تو سچی ہوتی ہیں لیکن نام سارے جھوٹے ہوتے ہیں تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔"

"تم میری کہانی بھی لکھ سکتی ہو بی بی؟"

"اگر تم کہو تو ضرور لکھ دوں گی۔"

"میرا نام کرماں والی ہے۔ میرا نام خیر ہے تم جھوٹا مت بھی لکھو۔ میں کوئی جھوٹ تھوڑی ہی بولتی ہوں۔ میں نے سچ بات کہنی ہے۔ لیکن میری بات کوئی نہیں سنتا۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ناٹ کے پیچھے ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لے گئی۔

"جب دو عورتیں میرا ناپ لینے کے لیے آئیں تو ان میں سے ایک لڑکی میری نند تھی۔ بالکل میری ہم عمر۔ وہ دور نزدیک کے رشتوں میں میری نندیں لگتی تھیں۔ وہ میرا ناپ لیکر کہنے لگی "بالکل میرا ہی ناپ ہے۔ بھابھی تم فکر مت کرو۔ جو کپڑے میں سیوں گی تمہیں پورے آئیں گے۔"

اور سچ مچ جہیز کے جتنے بھی کپڑے تھے وہ سب کے سب مجھ پر پورے اترے تھے۔

وہی نند کئی مہینے میرے پاس رہی۔ بعد میں بھی میرے جتنے کپڑے بنتے تھے وہی پہنتی تھی۔ وہ میرے ساتھ لاڈ بھی خوب کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی ''بھابی چاہے میں دو مہینے نہ آؤں یا کہ چھ مہینے پر تم نے کسی اور سے کپڑے نہیں سلوانے۔۔۔''

مجھے وہ بہت اچھی لگتی تھی' صرف ایک ہی بات مجھے بری لگتی تھی۔ وہ میرا جو بھی سوٹ لیتی تھی' پہلے وہ خود پہن کے دیکھتی تھی' کہتی تھی ''تمہارا میرا ایک ہی ناپ ہے۔ دیکھوں مجھے کتنا پورا آیا ہے' تمہیں بھی پورا آئے گا۔'' وہ سارے ہی کپڑے پہننے لگی اور میرے دل میں ہر وقت یہ بات رہتی تھی۔

''کپڑے چاہے نئے ہیں مگر ہیں تو اس کا پہنا واں''

رسی پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کا پردہ تھا' بان کی ڈھیلی ڈھالی چارپائی تھی اور۔۔۔ بھی پرانا تھا۔ لڑکی نوجوان اور ان پڑھ تھی مگر اس کا خیال انتہائی نازک اور اچھوتا۔۔۔'' میں حیران رہ گئی۔

''پر بی بی میں نے اپنے من کی بات اسے کبھی نہ کہی کہیں بیچاری برا نہ مان لے۔''

''پھر؟''

''پھر مجھے کچھ عرصہ پہلے پتا چلا' کسی نے ویسے ہی بتا دیا۔ اس کی اور میرے گھر والے کی آپس میں چکر تھا۔ یہ اس کا دادے ہال بھائی لگتا تھا۔ لیکن اس کے سگے بھائیوں کو اس بات پر شدید غصہ آتا تھا۔ انھوں نے ایک دفعہ اپنی بہن کو پیٹا بھی تھا۔

کسی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ گھوڑی کی رسم کے وقت جب وہ لگام کو بل دینے لگی تو بے ہوش ہوگئی۔

ٹوٹے ہوئے سانسوں والی قسمت والی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا' ''بی بی! تم میری بات سمجھ لو۔ میں کسی کا اتارا نہیں پہن سکتی۔ میری گوٹے کناری والی شلواریں' میرے ناروں والے دوپٹے اور میرے سلموں ستاروں والے کپڑے۔ سارے اس کا پہناوٗ تھا اور میرے کپڑوں کی طرح میرا گھر والا بھی۔۔۔''

قسمت والی کے بول کے آگے میری قلم رُک گئی۔ کون سا لکھاری ایسا فقرہ لکھ سکتا ہے۔۔۔

''اب بی بی میں وہ سارے کپڑے اتار آئی ہوں اور اپنا خاوند بھی۔ میں یہاں ماموں جمالی کے پاس آ گئی ہوں۔ ان کا گھر صاف ستھرا کرتی ہوں۔ میز دھوتی ہوں اور میں نے ایک مشین بھی رکھی ہوئی ہے۔ چار پیسے کماتی ہوں اور روٹی کھا لیتی ہوں۔ چاہے وہ کھدر کے جوڑے ہوں یا چاہے لٹھے کے' میں کسی کا پہناوٗ نہیں پہنتی۔ میرا ماموں میری صلح کرانا چاہتا ہے مگر وہ میری دل کی بات نہیں سمجھتا۔ میں جس طرح جی رہی ہوں اسی طرح جیوں گی۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی تم

صرف میری کہانی لکھ دو۔۔۔"

قسمت والی نے جس طرح سے کہانی کو پرکھا تھا' اُسے میں نے ایک بار اپنی باہنوں میں بھیجا۔

وہاں وہ قسمت والی کتنی بہادری کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔۔۔"

باہر سڑک پر شملے سے آنے والی گاڑیاں گزرتی ہیں اور جس کی سواریاں ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوتیں ہیں۔ کئی بار وہ پل پر کسی دکان پر چائے کے پیالے کے لیے ٹھہر جاتیں ہیں۔ پان سگریٹ کی ڈبیا لیتے ہیں' یا تندور کی گرم روٹی' ان کے گلے کے ریشمی کپڑے نجانے کس کس کا پہناوٗ ہوتے ہیں اور قسمت والی جس کے گلے میں کھدردی قمیض ہوتی ہے اور جو اپنے گاؤں کے کسی شخص کا اتارا نہیں پہن سکتی۔۔۔"

"بی بی' میں نے تمہارا وہ روپیہ سنبھال لیا تھا۔"

"سچ سچ ابھی تک۔۔۔"

"ہاں بی بی! وہ روپیہ میں نے اس وقت اپنی نائن کو پکڑا دیا تھا۔ پھر جب میں نے اخبار میں تمہاری تصویر دیکھی تھی تو میں نے نائن سے وہ روپیہ سنبھال لیا تھا۔ بی بی' تم مجھے اس روپے پر اپنا نام و پتہ لکھ دو۔ پھر جب تم میری کہانی لکھو گی' مجھے ضرور بھیجنا' میں گرمکھی اچھی طرح سمجھ لیتی ہوں۔ تم گرمکھی میں لکھنا بی بی۔"

قسمت والی نے اٹھ کر چارپائی کے نیچے رکھا ہوا ٹرنک کھولا۔ اس میں ایک صندوقچی تھی۔ اس نے ایک روپے کا تہہ کیا نوٹ کھول لیا

"میں اپنا نام لکھ دیتی ہوں کرماں والی۔ معلوم نہیں اب تک میں نے کتنی ہی لڑکیوں کے نوٹوں پر اپنا نام لکھا ہوگا۔ لیکن آج میرا دل کرتا ہے' تم میرے ایک نوٹ پر اپنا نام لکھ دے۔ کہانی لکھنے والا بڑا نہیں ہوتا۔ بڑا وہ ہوتا ہے جس نے کہانی اپنے اوپر جھیلی ہے۔"

"مجھے اچھی طرح لکھنا نہیں آتا۔"

قسمت والی خاموش ہوگئی اور پھر کہنے لگی

"تم نے میرا نام کہانی میں ضرور لکھنا ہے۔"

وہاں! میں تمہارے ہاتھ سے لکھے ہوئے نوٹ والے نام پر اپنی کہانی کا نام رکھوں گی۔" میں نے پرس سے نوٹ اور قلم دونوں نکال لیے۔

"قسمت والی! آج میں تمہاری کہانی لکھ رہی ہوں۔ اس روپے کے نوٹ پر لکھا ہوا تمہارا نام۔ آج اس کہانی کے ماتھے پر سجی ہوئی بندیا کی طرح ہے۔"

اس کہانی سے تمہارا کچھ نہیں مگر یہ بھروسہ رکھنا۔ وہ دل بھی تیری اس بندیا کو سلام کرتا ہے جنھوں نے اپنے خون وارنگ اس تیری بندیا کے رگ میں رنگ دیا ہے۔ اور وہ ماتھے شرمندگی کے ساتھ اس کے آگے جھکتے ہیں جنھوں نے اپنے گلے میں نجانے کس کس کا پہناوٗ پہنا ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆

نیلا لفافہ [کہانی]

لو ''قلوپطرہ'' تمہارا چیلنج کسی نے سن لیا ہے۔
تم جانتی ہو،
بعض اوقات بندے کی چھٹی حِس ، باقی پانچ حِسوں کو یرغمال بنا کے سُولی پہ لٹکا دیتی ہے اور کہتی ہے میری بات سنو۔
اُس صبح بھی ایسا ہی ہوا۔
دفتر کی میز پہ سرکاری ڈاک کے ساتھ ذاتی ڈاک کا فولڈر کھولا تو سامنے وہ نیلا پتلا لفافہ۔ باقی ساری ڈاک جیسے دریا برد۔ فولڈر میں کچھ ادبی پرچے دو تین اور بھی لفافے تھے، مگر وہ نیلا پتلا لفافہ جیسے اُٹھ اُٹھ کے کہے مجھے کھول۔
اُسے ہاتھ میں پکڑ کے الٹ پلٹ کے دیکھا۔
اُس پہ صرف میرا ایڈریس لکھا تھا، بھیجنے والے کا نام پتہ درج نہ تھا۔ ایک بار کھولنے بھی لگا پھر سوچا سرکاری ڈاک پہلے دیکھ لوں۔
سرکاری خطوط پڑھتے ہوئے بھی ذہن میں نیلا لفافہ چکارے مارے۔
دھیان کہیں اور جمنے نہ دے۔
فارغ ہوتے ہی، میں نے میز کی کُنّی پہ لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ سوچا دفتر اردلی کو کہوں سرکاری ڈاک اٹھا لے۔ گھومتے پہیوں والی کرسی پہ ذرا گھوم کے سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ کی ڈبی اٹھا کے سگریٹ نکال کے منہ میں لیا، کرسی کی ''ریکلائنگ'' پوزیشن پہ کمر سیدھی کی اور وہ نیلا پتلا لفافہ اٹھا کے اُس کی کنی کاٹی تو عجیب سی ''چر'' آواز آئی، جیسے کسی کی نَس کٹ گئی ہو۔ جسم میں عجیب سی سنسناہٹ کی مہین گھنٹیاں بجی۔
لفافہ کھولا۔
اندر ''ڈائری'' کا ایک کاغذ، تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔
تہہ کھول کے اُسے پڑھنے سے پہلے جیسے میری چھٹی حِس خبردار کر رہی تھی کہ یہ کوئی

ابدال بیلا

عام خط نہیں۔

وہی ہوا۔

ابھی تیسری سطر تک پہنچا تھا کہ "ریکلائنگ پوزیشن" سے جھٹکے سے آگے اُٹھا،

اُسی لمحے دروازے سے دو قدم اندر آ کے، اردلی نے فرش پہ زور دار پاؤں مار کے سلوٹ مارا اور میز سے سرکاری ڈاک اٹھانے کو بڑھا۔ خط پڑھتے ہوئے، اضطرابی کیفیت میں ہلا میرا ہاتھ اُسے منع کر گیا۔ وہ پھر پاؤں جوڑ کے سلوٹ مار کے باہر کو مڑا تو، میرے ہیجانی گلے میں پٹھوں کی چرچراہٹ سی ہوئی،

میری دھیمی سی آواز اُبھری۔

"نو کال، نو گیسٹ"

اردلی کے اِس بار سلوٹ مارنے کی آواز جیسے میرے ذہن نے سنی ہی نہیں۔ منہ سے دبا سگریٹ سلگھانے کے لیے، بے خیالی میں میرا اندھا ہاتھ میز پہ لائٹر ڈھونڈتا رینگ رہا تھا۔ وہ لائٹر ہاتھ میں خط کے ساتھ پکڑا ہوا تھا۔

خط عجیب تھا۔

چند سطروں کے لکھے اُس خط نے میرے اندر کے بخیے ادھیڑ دیے۔

ابدال

آپ افسر ہیں، ڈاکٹر ہیں، مجھے اس سے غرض نہیں۔

آپ میرے پسندیدہ ناول "دروازہ کھلتا ہے" کے مصنف ہیں۔

بس۔

اور اُس ناول کی "تم" میں ہوں۔ جتنی بار یہ ناول پڑھا، یہی حقیقت معلوم ہوئی، اس راز کو جان کے میری جان سُولی پہ لٹکی ہوئی ہے۔ آپ کے لکھے لفظ لفظ میں، انیسویں اور بیسویں صدی کی ثقافت ناچتی ہے۔

اُدھر ہی ڈوبی اُدھر ہر منظر میں ہی ہوں، جدھر آپ مجھے لیے پھرے۔

اب مجھ سے اور قدم نہیں اٹھائے جاتے اس زمین پہ۔ اس احساس سے کہ آپ کی "تم" تو میں خود سے بن گئی، آپ تو "میرے" نہیں ہوئے۔ یہ بہت درد دینے والا عذاب ہے جو مجھے زندہ نہ رہنے دے گا۔ ایک بار مجھ سے مل لیجیے۔ بس اور کچھ نہیں مانگتی۔

ورنہ مر جاؤں گی۔

"خودکشی" کر لوں گی۔

چوبیس سال کی ہوں، میڈیکل ڈاکٹر ہوں۔

مرنا مجھے آتا ہے۔

اگر آپ آج شام مجھے یہاں نہ ملے تو میری موت کے ذمے دار آپ ہوں گے۔

خط ختم۔

میرا پسینہ نکل گیا۔

دل سینے میں ایسے زور سے دھڑکا جیسے پسلیاں توڑ کے باہر آ جائے گا۔

نیچے ایک ''ریستورانت'' کا نام درج تھا۔
ساتھ وقت لکھا تھا۔ پانچ بجے۔
بریکٹ میں باریک سا، یہ بھی لکھا تھا کہ
''آپ مجھے نہیں جانتے، نہ پہچانتے، مگر
میں آپ کو پہچان لوں گی۔''
اُف
یہ کیا؟
کون ہے یہ؟
میں بدحواس ہوا، وہ کاغذ الٹ پلٹ کے
دیکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر، ''ڈائری''
سے پھٹے اُس کاغذ کے ماتھے پہ پڑی۔ اُس
پہ ایک دن پہلے کی تاریخ چھپی تھی۔ نیچے نہ
اُس لڑکی کا نام، نہ پتہ، نہ کوئی ٹیلی فون، اتنا
سمجھ گیا کہ معاملہ بہت سنجیدہ ہے۔ ماتھے پہ
تریلیاں آ گئیں۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔
ٹانگوں کے پٹھے اکڑ گئے۔
سگریٹ سلگھا لیا۔
دھواں بھی منہ سے بے ربط سا نکلے۔
سگریٹ کے کش زور سے لگانے سے دل کی
دھڑکن اور تیز ہو گئی۔
اتنا سمجھ گیا کہ اُدھر جانا پڑے گا۔
مگر ''ریستورانت'' تو آج کل بند۔
''کرونا'' کی بادشاہی ہے۔ یہ ''مس کرونا''
کدھر سے آ گئی؟
دل میں وسوسے بھی آئیں۔
کوئی سازش نہ ہو۔
مگر مجھے کیا خطرہ تھا؟
دور دور تک کسی سے میری دشمنی نہ تھی۔
پھر کسی نے مجھے کیوں نقصان پہنچانا۔
ہاں، کتابوں کی فین بہت تھیں۔
کئی ملکوں میں تھیں۔
اسی ناول کا 'ڈاکٹر کیول دھیر' نے ''ہندی''
زبان میں ترجمہ کر کے پورے ہندوستان
میں پھیلایا ہوا تھا۔ جلندھر انڈیا کے ''ڈاکٹر
گلزار سنگھ پندیر'' نے اسے ''سرہند کنڈے''
کے نام سے ''گرمکھی'' میں ترجمہ کر کے
چندی گڑھ انڈیا سے شائع کیا ہوا تھا۔ نیپال
کی شاعرادیب ''گیتا'' نے اسے نیپالی میں
ڈھال رکھا تھا اور مصر الازہر یونیورسٹی قاہرہ
کی ''ڈاکٹر حنا'' اِسے عربی زبان میں منتقل
کر رہی تھی۔ وہی ڈاکٹر حنا، جو ''صفیہ
صلاح'' کی قاہرہ میں سپروائزر، صفیہ
صلاح وہ جس نے آقا پر ایم فل الازہر
یونیورسٹی قاہرہ مصر سے کیا اور آقا کا عربی
ترجمہ بھی کیا۔ بنگلہ دیش ڈھاکہ یونیورسٹی
کے ڈاکٹر عبدالاحد اِسے ''بنگلہ'' زبان کی
بنت میں بُننے میں لگے تھے۔
ستائش کے خط آتے تھے۔
بہت آتے تھے۔
ہر کوئی اپنے انداز میں بات کہتی۔ اپنی
پسندیدگی بتانے کے بہتیرے رنگ۔ ہر کوئی
اپنے رنگ کی رنگا رنگی میں جو کہنا ہوتا کہہ

دیتی۔ اُن کی باتوں میں کبھی کبھار انتہا کی لذت ابھارنے کے لیے حد سے زیادہ مبالغہ نظر آتا۔ جیسے کوئی لکھ دیتی۔

ناول پڑھا۔ اب ناول نگار پڑھنا۔

کوئی تو جیسے مدحوشی میں کچھ اُوٹ پٹانگ بھی لکھ دیتی۔ لکھتی، سنو، ''اب ناول پڑھ پڑھ کے دماغ میں پٹاخے پھٹ رہے ہیں، تم وہیں ٹھہرو، میں آ رہی، تمہیں اٹھا کے لے جانا، پھر میرے سامنے بیٹھ کے لکھا کرنا۔ میں تمہیں لکھتے دیکھا کروں گی۔''

کوئی کہتی ''کاش'' تمہاری ''تم'' میں ہوتی۔ اکثر یہ لکھ دیتیں، مجھے اپنی ''تم'' بنا لو۔ اپنے پاس رکھ لو۔ میرے ساتھ رہو۔ تم کیا چیز ہو۔ ''جادوگر'' ہو لفظوں کے۔ میرے ''ساحر'' مجھ سے مل لو۔ جو کسی کے دل میں آتا وہ کہہ دیتیں کئی لڑکیوں نے اجازت مانگی، تمہارا نام اپنے نام کے ساتھ لگا لوں، ایک نے لکھا، میرے بیٹا ہوا، اس کا نام ''ابدال'' رکھ لیا۔

میں پڑھ کے مسکرا دیتا، بات ختم۔

مگر کسی نے کبھی یوں نہ لکھا تھا۔

کہ، نہ ملے تو خودکشی کر لوں گی۔

دن بھی راہ میں کوئی نہ دیا۔

اُسے جیسے پتہ تھا، خط آج مجھے مل جائے گا۔

اُس دن سوچ قلوپطرہ، میرا کیا حال ہوا۔

اور کیا کرتا۔

شام بتائے ہوئے وقت سے پانچ منٹ پہلے اُدھر پہنچ گیا۔ نیلے نیلے پردوں والا، وہ بڑا نفیس سا ریستورانٹ تھا۔ بڑی بڑی دبیز صوفہ نما اونچی کرسیاں تھیں۔ ''کرونا'' کے دن تھے۔ اکثر ریستورانٹ بند پڑے تھے۔ وہ بھی سارا خالی تھا۔ ریستورانٹ کے دروازے پہ ماسک ٹوپی اور اور آل پہنے ''سینی ٹائزر'' کی بوتل کی پچکاریوں سے ہاتھوں کی ہتھیلیاں ازبر کی۔ ریستورانٹ میں اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ اکثر چار کرسیوں کے درمیان ایک میز تھا۔ سارا خالی ریستورانٹ۔

کدھر بیٹھوں؟

مناسب جگہ ڈھونڈنے میں کچھ دیر لگی۔ ریستورانٹ بھرا ہوا ہوتا تو جو جگہ خالی نظر آتی، شکر کر کے بیٹھ جاتا۔ ریستورانٹ ہو یا کوئی اور جگہ، خالی ہو تو بیٹھنے کی جگہ کا فیصلہ کرنے میں دیر لگتی ہے۔

جن دنوں میرے ''بھائی جان'' کی شادی ہونے والی تھی تو امی جی سے فیصلہ کرنے میں دیر لگی۔

میرے ''نانا'' اُن دنوں زندہ تھے۔

امی جی ایک دن نانا سے یہ مسئلہ چھیڑ کے بیٹھ گئیں، کدھر بیٹے کو بیاہ کے لاؤں۔

نانا ہنس کے بولے،

دیکھ، ابھی لاری خالی ہے۔

تجھے ہر طرف سے اشارہ ہے۔
ساری سیٹیں خالی ہیں۔
تبھی تجھ سے فیصلہ نہیں ہو رہا۔
لاری بھری ہوتی، سیٹیں ساری ملی گئیں
ہوتی تو معاملہ اور ہوتا۔
بندہ "ٹول بکس" پہ بھی شکر کر کے بیٹھ جاتا۔
میں سوچ رہا تھا کہ ساتھ کھڑکی ہو۔
کھڑکی سے باہر کی روشنی اُس کے چہرے پہ
پڑے۔ کھڑکی تو بند تھی۔
پھر بھی میں ایک کھڑکی کے آگے بیٹھ گیا۔
ویٹر سلام کر کے مجھے "مینیو" کارڈ دینے آیا۔
کارڈ پکڑتے میں نے اُسے کہا۔
ایک "گیسٹ" نے آنا ہے۔ پھر آرڈر
دوں گا۔
وہ سر جھکا کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے چلا گیا۔
دیوار پہ لگا کلاک ٹِک ٹِک چلنے لگا۔
دل کی دھڑکن سیکنڈ سوئی سے آگے آگے
دوڑنے لگی۔
میری کنپٹیوں میں نس نس بجنے لگی۔
میں سمجھ گیا، میری چھٹی حس اِدھر نبض بن
کے بج رہی ہے،
اچانک کلاک کی سوئیوں میں اک زلزلہ
سا آیا۔
ٹن ٹن کر کے کلاک بجنے لگا۔
ایک، دو، تین، چار یہاں تک ہی میں نے
کلاک کی گنتی ذہن میں دہرائی تھی کہ
پانچویں "ٹن" کے ساتھ ہی مدھرا بگولہ
سامنے اُٹھا اور اُس کے بیچ سے ایک دم نیچے
سے اُوپر آتی سیڑھیوں سے سُرو کا پودا گلاب
پہن کے سونے کے ورق ورق سے لدا
میرے سامنے ابھرا، ساتھ آتے ویٹر نے
بڑھ کے اُس کی کرسی بیٹھنے کے لیے پیچھے کی
اور میں منہ کھول کے حیران سحر زدہ بے ربط
سا ہوا ایک دم اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔
میرے سامنے ایک "پری" کھڑی تھی۔
زور سے اندر لیا سانس، باہر اچھل کے نکلتے
وقت میرے گالوں میں اٹک کے رہ گیا۔
کیا کوئی انسان زادی اتنی خوبصورت بھی ہو
سکتی ہے۔
قلو پطرہ، تمہارے علاوہ
سر سے پاؤں تک سنگِ مرمر سے تراشا ہوا
پیرس کے میوزیم میں ایستادہ "ایفروڈائٹ"
کا مجسمہ جس میں کسی جادوئی کرم سے ایکا
ایکی میں زندگی لپک آئی ہو اور وہ اُڑ کے
اِدھر آ گئی ہو۔
اُف۔
اُس کے آتے ہی وہ نیم تاریک سا گوشہ
ایک دم نُور سے بھر گیا۔
روشنی اُس کے رُوں رُوں سے اچھلے۔
آنکھیں ہیرے کی کنی کو کہنی مار کے،
چھریاں بنی میرے آر پار۔ نگہ اُس کی
ایسی، لگے جدھر تک رہی، اُدھر آسمان کی

''ملکی ویز'' سوئی ہوئی جگا رہی تاروں کی۔
تاروں کا ہجوم مل کے چاند بنے، جب وہ نگہ
کی انی سیدھی دل میں پروئے۔
چاند بھی کوئی ایسا ویسا۔
''پورن ماشی'' کا۔
جس کی چاندنی سحر طاری کر دیتی۔
جس کی چاندنی کے بکھرے اجالے کے
سایے میں سرمئی سرخی سی ہو، پر اسرار۔
ایسا حُسن، وہ بھی سامنے۔
پھر ایسا فدا۔
اسے تو سوچ کے، سوچ کپکپا جائے۔
ایسا حُسن جسے دیکھ کے ''بندہ'' سہم جائے۔
منہ سے کچھ نہ نکلے۔
وہی ہوا۔
وہی بولی، بیٹھیے!
بے ہنگم سا ہو کے میں بیٹھ گیا۔ اُس نے
میرے برابر بڑے صوفے پہ اپنے کندھے
سے اتار کے اک بیگ رکھا اور میز کے پار،
میز میری طرف دھکیلتی ہوئی اپنی صوفہ چیئر
بھی آگے سرکا کے دھم سے بیٹھ گئی۔
''دھم'' کی آواز کہیں نہ آئی۔
تھی ہی وہ پتلی سی، لمبی، تھوڑے سے وزن
کی لڑکی۔ اُسے کندھے پہ اٹھا کے اُسی وقت
بھاگ جانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اور حیرت
انگیز بات یہ تھی، الٹا وہ مجھے ''چوتاؤنی''
دے چکی تھی، دھمکی دے چکی تھی کہ نہ ملے تو
''خودکشی'' کر لوں گی۔
تم ڈاکٹر ہو؟
میں نے بدحواسی سے بول دیا۔ حالانکہ وہ
خط میں لکھ چکی تھی۔ اُس وقت بھی وہ اپنی
نیلی شرٹ اور نیلی جین کے اوپر سفید
اوورآل پہنے ہوئے تھی۔ اوورآل کی جیب
سے باہر سٹیتھوسکوپ کی کانوں کی کنیاں
اُٹھی ہوئیں تھی۔
جی، وہ مسکرا کے بولی۔
اُس کے چھوٹے سے گلاب کی معصوم سی
پتیوں کو پکڑ کے مرمریں موتی مجسمے کے
چہرے پہ لگے ہونٹ۔ ہونٹوں کے کنارے
گالوں میں گئے۔ گالوں میں گڑھے سے پڑ
گئے۔ چکنے شفاف ملائم گال ہنڈے کی طرح
جگمگا گئے، جیسے اندر بلب جلے ہوں۔ وہ
صوفے پہ بیٹھی ہوئی آگے کو جھکی ہوئی تھی اور
اُس کے سینے میں سانس رُکے، اُس کے
ابھاروں کو لرزا رہے تھے، میں حیران،
بات میرے منہ سے نہیں نکل رہی، یہ
کیوں نروس؟
تم ڈاکٹر ہو کے بھی، سچ میں واقعی ''خودکشی''
کر لیتی۔
جی، وہ اس بار اتنا مسکرائی کہ اُس کے ہونٹ
کانوں کی طرف سرک کے گالوں کو دمکا
کے، اُن کے گڑھے اور گہرے بنا گئے۔
کس طریقے سے، سوچا تھا۔ ''خودکشی''

کرنا؟

دو طریقے تھے ذہن میں۔ وہ سنجیدہ چہرہ بنا کے بولی۔

میں سہم گیا، سہمے سہمے پوچھا کون کون سے؟

چہرے پہ وہ پری ایک دم سنجیدگی لا کے بولی

اک تو، سلیپنگ پلز" سے۔ یہ کہہ کے مسکرائی،

بولی، ڈاکٹر ہوں نا۔

دوسرا طریقہ کیا سوچا تھا؟

تھوڑی دیر وہ چپ رہی،

بولی، میرا وارڈ پانچویں فلور پہ ہے۔

تو

وہیں سے چھلانگ لگا کے، کود کے۔

اُف۔

تم تو بہت خطرناک باتیں کرتی ہو۔

میں نے اپنی نشست پہ بیٹھے بیٹھے دبک کے خوف زدہ ہو کے اُسے کہا۔

وہ گالوں میں گڑھے ڈال کے پھر مسکرا کے نگہ میں ہیروں کی لڑیاں پرو کے ابرو اُٹھا کے پوچھنے لگی۔

آپ جو لفظ لفظ پہ جان نکال لیتے، وہ؟

میری توبہ، میں نے کیا قصور کیا۔

جادوگری،

سامری ساحری

پڑھنے والوں کو ایک ایک سطر پہ مونڈا کر دینا۔ چھری سے کاٹ کے کبھی زندہ جان کی کھال اتار لینا، آپ کے لیے کوئی قانون نہیں؟

اُس کے گالوں کے گڑھے اور گہرے ہوئے۔

ہے تو نہیں قانون، تم بنا دو۔

یہی بنانے آج آئی ہوں۔

"خودکشی" والی بات ڈرامہ ہی تھی نا؟

قسم سے نہیں۔

اوہ۔

دیکھو، بیگ کے اندر ڈال کے لائی ہوں،

"سلیپنگ پلز" کی پوری بوتل بھر کے۔

دکھاؤں؟

دکھاؤ نا۔ بلکہ مجھے دے دو۔

میں ہنستے ہوئے بولا، پتہ کیوں؟

کیوں؟ اُن گالوں میں خفیف سے گڑھے پڑے۔

مجھے نیند نہیں آتی، جلدی۔

دو دو تین راتیں جاگتے گزر جاتیں، میں بولا۔

کیوں؟ یہ انسومنیا؟

بس، کبھی کوئی خیال، کبھی بے خیال اب تو، دے ہی دو مجھے ساری اکٹھی اٹھائی ہوئی "سلیپنگ پلز"۔

حیرت ہے، وہ مسکرا کے بولی۔

کیوں؟

آپ مجھ سے "سلیپنگ پلز" مانگ رہے؟

پھر کیا مانگوں؟ میں روہانسا سا منہ کر کے بولا،

میں آ گئی نا، پوری کی پوری۔ مجھے اپنی ''تم'' بنالیں۔

پری، تم تو پری ہو، پری بھی وہ جس کی تلاش میں سالوں ''سیف الملوک'' بھاگتا پھرتا، تم جادوگروں کے ہاتھوں میں گئی۔ ہاتھ نہیں آتی، وہ پری۔ اتنے میں ''ریستورانت'' کا ''ویٹر'' میرے پہلو میں آ ''اٹین اشین'' ہوا کھڑا ہو گیا۔ کیا پتہ پہلے سے کھڑا ہو، محسوس ہی اب ہوا۔ اُس کی طرف دیکھا، تو اُس نے ادب سے جھک کی مینیو کارڈ مجھے پکڑایا، دوسرا پری کے سامنے رکھا، میں نے مینیو کارڈ پہ ہاتھ مارتے کہا،

پری، ایز یو وِش۔ بتاؤ۔

آف کورس، آئی وِل وِش۔

وہ میری طرف تکہ گھما کے، ابرو اٹھا کے، راجکماری کی طرح بولی۔ ''دِس فوڈ ایز فرام می۔''

نو نو۔ میں نے ہاتھ اٹھایا۔

نو، اُس کے چہرے پہ کسی سلطنت کی ملکہ جیسا، چہرہ تھا۔

''قلوپطرہ'' تمہارا چہرہ۔

پھر ''مینیو کارڈ'' دیکھتی ہوئی بولی۔

پتہ آج میں بہت پیٹ بھر کے کھاؤں گی، کیونکہ میں تو اپنی طرف سے آخری کھانا کھا چکی تھی۔ اب تو بیگ میں رکھی ''سلیپنگ پلز'' کھانا تھیں۔ اُس نے کچھ ڈشوں کے نام لے کر، میری طرف ابرو اٹھا کے پوچھا۔ ایسے دل میں کلیاں سی جا گیں، جیسے سرِ عام ویٹر کے سامنے اُس نے کوئی فحش اشارہ کیا ہو۔ اُس کے ابرو کمان بن کے پھڑ پھڑائے ہی ایسی تان میں تھے، کہ میرے اندر اپنی ساری تاریں کلبلا گئیں۔

وہ میز پہ کہنیاں جما کے ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھتی جائے۔ میرے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔ میں نگہ جھکا کے شرمندہ سا ہوا بیٹھا، اُسے بولا، ''سلیپنگ پلز'' تو ڈاکٹر استعمال کر لیتے، مگر یہ دوسرا طریقہ سن کے اوسان خطا ہو گئے۔

چینی کی پلیٹوں اور پیالیوں میں رکھے چاندی کے چمچے سے کھنکھنائے۔ میں سمجھا ویٹر برتن کی ٹرے لے کر آ گیا۔ سر اٹھا کے دیکھا تو وہ ہنستی ہوئی اپنی جگہ سے اُٹھ کے میرے برابر رکھے، پرس کو میز پہ رکھتی ہوئی ساتھ بیٹھتی بولی، شکر ہے میں بچ گئی۔

پر میں مارا گیا۔

میں یہ کہہ کے ہنسنے لگا۔

میرے ساتھ وہ ایسا قہقہہ مار کے ہنسی کہ ریستورانت کا منیجر ایک دم اندر کچن، کٹلری شاپ کی طرف لپکا، جیسے پورے ریستورانت کی کٹلری بھری شیشے لگی الماری تھرتھرا کے گر گئی ہو۔

☆☆☆☆☆

جذبات سے عاری آدمی

محمد افتخار شفیع

دریا کے کنارے پر موجود اونچی اونچی حویلیوں والا ایک گاؤں تھا۔ مملکتِ خداداد کا یہ گاؤں قریب ہی ایک ٹیلے پر آباد کیا گیا تھا۔ اس کے گھروں کی چھتوں پر بنائی گئی بڑی بڑی ممٹیاں اور مساجد کے مینار دور سے دکھائی دیتے تھے۔ گاؤں کے مکینوں نے پتا نہیں کیا سوچ کر یہاں محل نما گھر بنائے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دریا کے کنارے پر گھر بنانے کا فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی، دو تین سال بعد برسات کے موسم میں طغیانی آتی اور ارد گرد کی فصلوں کو بہا کر لے جاتی، دان کرنے کے لیے کنواری کنیائیں تو نہ تھیں لیکن خیرات ویرات کا سلسلہ چلتا رہتا، لیکن اس بار حالات کچھ زیادہ ہی خراب لگ رہے تھے۔ دریا کا پانی کناروں سے باہر تو نہیں نکلا تھا لیکن کٹاؤ نے اسے بالکل وحشی بنا دیا تھا، اس سے پہلے دریا نے آدھا گاؤں نگل لیا تھا۔ چند سال بعد اس کا رخ ایک بار پھر گاؤں کی طرف تھا، پہلے ہری بھری فصلیں برباد ہوئیں اور اب مکینوں کے گھر دریا کے نشانے پر تھے۔

گاؤں کے مجبور اور ناچار لوگ اپنا اپنا مال واسباب بچانے کی تدبیریں کر رہے

تھے۔ دریا کے کناروں پر آباد قبائل اپنے گھروں میں زیادہ ساز و سامان تو نہیں رکھتے تھے ۔ بس زندگی کی بنیادی ضروریات کی چند چیزیں ہوتی تھیں، لوگوں کی زیادہ توجہ محدود کاشت کاری اور مال مویشی پالنے کی طرف تھی۔ کنارے پر پانی دائروں میں گھومتے گھومتے زمین کے نیچے بل بنا کر بھربھری مٹی کو مزید گیلا اور نرم کرتا ،اس کے اثرات زمین کی اوپری سطح پر محسوس نہیں ہوتے تھے ۔اچانک گھم، گھم کی آواز آتی اور متاثرہ زمین کا ٹکڑا دریا برد ہو جاتا۔ متمول لوگ محفوظ علاقوں کی طرف نقل مکانی کر گئے تھے، وہی بچ گئے تھے جو کہیں جانے کی استطاعت نہ رکھتے تھے ۔۔ حکومت کی طرف سے بنایا گیا حفاظتی بند بھی ریت کی دیوار ثابت ہوا تھا۔ ہماری طرح دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے لوگ اس غم ناک صورت حال سے یکسر بے نیاز کٹاؤ کا یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انھیں گاؤں کے لوگوں کی اس بے بسی سے جیسے کوئی غرض ہی نہ تھی۔

اس روز ہوا کچھ یوں کہ ہم دوستوں نے گھر کی بیوست زدہ زندگی سے اکتا کر ایک دن کے لیے پکنک پر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ اتوار کا ایک روپہلا دن تھا، پیلی پیلی دھوپ چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ علی الصبح ہم دریا کی سیر کو نکلے، مجھے دریا ہمیشہ سے بہت پرکشش لگتے ہیں، ہماری صدیوں پرانی تہذیب کے محافظ، عشق و محبت کی لازوال داستانوں کے رازدار اور اپنے بطون میں نہ جانے کتنی سسکیاں چھپائے ہوئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو بہت سے اور لوگ بھی وہاں پکنک منانے آئے ہوئے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ مقامی لوگوں کے دکھ میں شامل ہونے کے بجائے ان کی بے بسی کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے دوستوں کے چہرے پر بھی ایک خاص قسم کی خوشی تھی، جیسے وہ اس ماحول کو دیکھ کر لطف کشید کر رہے ہوں۔ گرد و نواح کی بستیوں سے آئے ہوئے لوگوں میں پولیس کے چند اہل کار، مختلف دفتروں کے ملازم اور چھوٹے موٹے کاروباری شامل تھے۔ اجڈ شکلوں والی کر بدنما عورتیں، بڑی بڑی مونچھوں والے بدقطع مرد اور ننگ دھڑنگ بچے بھی اس ہجوم کا حصہ تھے۔ سب کے ہونٹوں پر ہمدردی اور اخلاص پر مبنی جملے تھے لیکن چہروں پر شادمانی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے تمام لوگوں نے بشاش چہروں پر اداسی کے ماسک پہن رکھے ہیں۔ میں شاید تمام لوگوں میں واحد غم زدہ آدمی تھا۔ میرے چہرے پر دکھ کے آثار نمایاں تھے ۔ کنارے پر کھڑے مقامی تیراک لڑکے دریا میں کود کر ادھر ادھر بہ جانے والا، بچا کھچا سامان نکالنے کی کوشش کر رہے تھے، کچھ فاصلے پر ذرا پیچھے ہٹ کر چند دیہاتی عورتیں

چادروں سے منہ چھپائے کورس کی شکل میں بین کر رہی تھیں، ان کی آوازیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں لیکن میں ان میں چھپے کرب کو آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ کاش میں ان کے قیمتی آنسوؤں کی قیمت ادا کر سکتا، یہ منظر دیکھنے کی ہمت نہ رہی تو فرطِ غم سے میں نے آنکھیں موند لیں۔ ابھی میں آنکھیں بند کیے کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے کندھے پر ایک بھاری ہاتھ کا بوجھ محسوس ہوا۔ سٹپٹا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ رنگ برنگی وردی میں ملبوس ایک پولیس والا تھا جو پولیس والا کم اور تاش کا جوکر زیادہ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تازگی کے برعکس تشنج کے آثار تھے، اس کی یہ بے تکلفی مجھے اس وقت کچھ زیادہ اچھی نہ لگی۔ میرے کندھے پر اس کے مضبوط ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا جاتا تھا۔ کوشش کے باوجود میں اس کی گرفت سے خود کو آزاد نہ کروا سکا۔

"بے بنیاد آدمی! تمہارے چہرے پر یہ اداسی کے آثار اچھے نہیں لگ رہے"

"لیکن یہ میرے اختیار میں نہیں کہ میں اپنے جذبات دوسروں سے چھپا سکوں، میں بے بس ہوں جناب"

"تمہیں معلوم نہیں کہ آج سے ملک میں بادشاہ سلامت کا دو روزہ جشنِ صحت منایا جا رہا ہے۔ خیر سے چند دن پہلے انھیں دماغی خلجان سے نجات ملی ہے۔ عوام کو شہر شہر گاؤں گاؤں چراغاں کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس خوشی کے موقعہ پر کل صبح شہر کے بڑے میدان میں تمام مرد و زن جشن منا رہے ہیں۔ سب مل کر ناچیں گے، گائیں گے، بادشاہ سلامت کی صحت کی خوشی میں جام لنڈھائیں گے۔

"میں تو ان مصیبت زدہ لوگوں کی بے بسی دیکھ کر افسردہ ہو گیا تھا۔ ویسے مجھے ان سے کوئی خاص ہمدردی نہیں ہے۔ میں بالکل اداس نہیں، میں نے پہلو بچانے کی کوشش کی"

"تمہارا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟، دیکھو! ہمیں بے وقوف مت بناؤ"

سپاہی کے لہجے میں ایک خاص قسم کا رعب تھا، میری آواز اس کی آواز میں دب گئی۔

(آپ نے کبھی بھیڑیے کی غراہٹ کے سامنے میمنے کی بے اوقات ممیاہٹ دیکھی ہے؟)

"یہ سیدھا سادھا غداری اور بغاوت کا کیس ہے۔ تمہیں گرفتار کرنا ہماری مجبوری ہے۔"

"لیکن جناب!!" ۔۔ "خاموش!!" میری ساری التجائیں بے کار گئیں، کچھ دیر بعد میں ہتھکڑی پہنے پولیس کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ میرا مقدمہ جس جج کی عدالت میں پیش کیا گیا وہ چہرے مہرے سے ایک رحم دل آدمی لگتا تھا۔

"نوجوان! نیا قانون بنا ہے کہ اس ملک کا ہر باشندہ ہمہ وقت خوش نظر آئے۔

بادشاہ سلامت کی صحت کے جشن کے موقعہ پر غم زدہ ہونا دوہرا جرم ہوا، دیکھو! یہ جرم بغاوت اور غداری سے کم نہیں، تمہارے لیے نیک تمنائیں'' - جج کی باچھیں خوشی سے پھیل گئیں۔

گواہوں کے بیانات اور ثبوتوں کی روشنی میں جرم ثابت ہونے کے بعد مجھے صرف سات سال قید کی سزا سنائی گئی۔ غداری کی سزا موت ہے لیکن جج صاحب نے شاید میری کم عمری کا خیال کرتے ہوئے میری سزا میں کچھ تخفیف کردی تھی۔ عدالت سے جیل کی طرف جاتے ہوئے شہر کا ہر باشندہ مجھے بہت خوش نظر آیا لیکن ان سب کی آنکھیں کسی خشک چشمے کی طرح ویران تھیں۔ راہ گیر مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھتے اور نہ جانے کیوں کنی کترا کر کسی اور راستے کی طرف نکل جاتے۔ چند میل کی مسافت پر جیل تھی - وہاں پہنچ کر مجھے قدرے سکون ملا کیوں کہ وہاں موجود تمام قیدی اداس چہروں والے تھے۔ میں ان میں شامل ہو کر خود کو ان جیسا محسوس کرنے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا۔ غم اور اداسی کے بارے میں میرے تصورات میں بھی تبدیلی آرہی تھی۔ اب میں نے اداس چہروں میں خوش رہنا سیکھ لیا تھا۔ میرے شاداب چہرے اور خدمت گزاری کو دیکھتے ہوئے میری سزا میں کمی کردی گئی اور اچھی کارکردگی کی بنیاد پر پانچ سال بعد ہی مجھے قید سے رہائی مل گئی۔ جیل سے رہا ہوتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اب میں مشکل سے مشکل حالات میں بھی خوش رہنا سیکھ گیا ہوں - میرے چہرے پر شگفتگی اور بشاشت کا ماسک چڑھا تھا، جیل کے ماحول نے بڑے آرام سے میری پلاسٹک سرجری کردی گئی تھی - اب میں ایک کامیاب اور خوش باش انسان تھا، ''شکریہ! اے قید خانے کے مقدس پانچ سالو!! اب میں تمہاری عنایات کے سبب ایک خوش و خرم انسان بن گیا ہوں''

جیل سے نکلتے ہوئے میں اپنے گھر کے راستے پر چل دیا، میں ایک مشہور گیت گنگنا رہا تھا۔ گیت کی ہلکی ہلکی لے مجھے مسرور کر رہی تھی - بائیں طرف مڑتے ہوئے پولیس کے پہلے ناکے پر مجھے روک لیا گیا۔

''رکو بھئی!! تم بڑے خوش لگ رہے ہو، کون ہو تم غافل انسان!! دوسروں کے غم میں شریک ہونا سیکھو، معلوم نہیں اب تک تم نے کن احمقوں کے ساتھ زندگی گزاری ہے''

''لیکن جناب!! میں نے تو بڑی مشکل سے خوش ہونا سیکھا ہے۔ یوں بھی خوش رہنا، اس مملکت کے ہر باشندے کا قومی فریضہ ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو گستاخ آدمی!! تمہیں معلوم نہیں کہ بادشاہ سلامت کی ذہنی بیماری کی وجہ سے وطن عزیز کے تمام باشندوں کو

مغموم رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پولیس افسر غصے سے بے قابو ہو گیا"

"محترم! پانچ سال پہلے تو ایسا نہ تھا۔ ان دنوں سب کو خوش رہنے کا فرمان جاری کیا گیا تھا"۔

"نیا قانون ابھی ایک ہفتہ پہلے جاری ہوا ہے۔ ملک بھر کے اخبارات اور ٹی وی چینلوں پر اس نئے حکم کی مسلسل تشہیر کی جا رہی ہے بے خبر آدمی، بادشاہ سلامت کے ذہنی خلجان کے سبب ساری قوم اداس ہے۔ سرکاری اور پرائیویٹ ٹی وی چینلوں کے اینکرز کو بھی بیماری کی خبر نشر کرتے ہوئے رونے کا حکم دیا گیا ہے! دفتروں کے تمام ملازمین سیاہ ماتمی لباس پہن کر سوگ منائیں گے"

"جناب! آپ نے بجا فرمایا، میں واقعی اس سے بے خبر تھا۔"

"بڑے عیار اور مکار انسان لگتے ہو، آج کل کون اتنا بے خبر ہے، تم سفید جھوٹ بول رہے ہو۔ ہم ملازم ہیں، قانون نافذ کرنا ہماری ذمہ داری ہے، تمہیں گرفتار کرنا ضروری ہے، تمہارے مستقبل کا فیصلہ تو اب عدالت ہی کرے گی"

عدالت میں پیشی کے بعد مجھے خوش دکھائی دینے کے جرم میں ایک دفعہ پھر سات سال قید کی سزا سنائی گئی۔ حسب سابق جیل میں میری اطاعت اور کارگزاری دیکھ کر مجھے پانچ سال بعد ہی رہا کر دیا گیا۔

رہائی کے بعد میں نے اپنے گھر کا رخ کیا، جہاں زندگی اپنے تمام ترہنگاموں سمیت میری منتظر تھی۔ ایک دن مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ کیوں نہ میں مملکتِ خداداد کے اس اونچی اونچی حویلیوں والے، دریا کے کنارے پر آباد گاؤں کو جا کر دیکھوں، جہاں کیمسا جد کے مینار اور حویلیوں کی ممٹیاں دور سے دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے ایک روپہلی صبح وہاں کا رخ کیا، چاروں طرف پیلی پیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دریا کا کٹاؤ جاری تھا، لوگ اپنی ضروریات کا سامان بچانے کی ویسے ہی تگ و دو کر رہے تھے۔ عورتوں کے بین کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ تماشا دیکھنے والے لوگ بھی اسی طرح موجود تھے۔ اس بار پہلے کے برعکس ان کے دلوں میں خوشی جب کہ چہروں پر اداسی کے روغنِ عیاری کا لیپ کیا ہوا تھا۔ پولیس کے اہل کار بھی بڑی جاں فشانی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میں اس سارے منظر سے بے پروا تھا۔ اب میرا جذبات واحساسات سے عاری چہرہ پتھر کی طرح رقیق اور بے رنگ تھا۔ اب مجھے پولیس والوں سے بھی بہ ظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا کیوں کہ جیل میں قید کے پہلے پانچ سالوں میں میرے چہرے سے غم اور دوسرے پانچ سالوں میں خوشی کے تاثرات ختم ہو چکے تھے۔

☆☆☆☆☆

دادا جان

میرے بچپن کے ساتھ ہی گویا دادا جان کا بچپنا بھی لوٹ آیا تھا- اب آنکھ مچولی، فٹ بال، مستیاں، شرارتیں، روٹھنا منانا سب کچھ مل کر ہی ہوتا تھا - دادا جان کو شائد میری پیدائش کا ہی انتظار تھا اور میری پیدائش اسے دوبارہ اس کے بچپن کے خانے میں لے کر چلی آئی تھی - میری انسیت بھی ابو امی کے مقابلے میں دادا جان سے کچھ زیادہ ہی تھی اور میں ان کو ہی اپنا سب کچھ سمجھنے بھی لگا تھا؛ بیک وقت ابا، امی، دوست اور مددگار، یہ تمام درجے ان کو حاصل ہو چکے تھے- اس کی ایک وجہ تو ان کا میرے ساتھ حد درجے کا لاڈ اور پیار تھا اور دوسری وجہ جو بعد میں میری سمجھ میں آئی یہ تھی کہ دراصل میری پرورش انھوں نے ہی تو کی تھی - ابو دفتر میں کام کرتے تھے اور صبح کے نکل کے کہیں شام ہی کو واپس گھر لوٹتے تھے - امی سکول میں استانی تھیں اور وہ بھی زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتی تھیں چنانچہ میری دیکھ بال اور پرورش کی ذمہ داری کلیتاً دادا جی ہی کے کندھوں پر آ پڑی تھی جسے وہ بڑے شوق اور لگن کے ساتھ نبھا رہے تھے - مجھے نہلانا دھلانا، کپڑے بدلنا، کھانا کھلانا، سکول چھوڑنا اور گھومنے گھمانے لے چلنا سب کچھ وہ ہی کیا کرتے تھے- ہوم ورک کرانے میں بھی مجھے ان کی مدد حاصل تھی- کبھی کبھار جب میری طبیعت کسی طرح بھی لکھنے لکھانے پر آمادہ نہ ہوتی تو دادا جان بے چارے خود ہی بیٹھ کر میری کاپیاں تک لکھ دیتے تھے-

چھوٹا سا تو گھر تھا ہمارا جس میں تین ہی کمرے تھے -نسبتاً بڑے کمرے میں دادا جان مقیم تھے اور یہی گھر کا مرکزی کمرہ تھا جس میں وہ اکیلے رہتے تھے- دادی کا انتقال کب اور کیسے ہوا، اس کا مجھے کچھ علم نہیں تھا- دوسرے نمبر کے کمرے میں امی ابو اور میں سوتے تھے جبکہ تیسرا کمرہ بطور ڈرائنگ روم استعمال ہوتا تھا اور مہمانوں کے لئے مخصوص تھا- کام کرنے کے لئے ایک نوکرانی مقرر تھی جو صبح کو آ کر شام کو واپس گھر چلی جاتی اور صفائی ستھرائی سمیت کھانے پکانے کی ذمہ داری اس کے سپرد تھی- دادا جان ہی گھر کے نگران تھے اور ان ہی کے فیصلوں کو اہمیت حاصل تھی- صبح کو امی ابو کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ ناشتہ کر کے باہر صحن میں نکل آتے- چھوٹے سے صحن میں دیگر کئی چھوٹے پودوں کے ساتھ تین چار پھلدار درخت بھی لگے تھے- دو پیڑ امرود کے اور دو آلوچوں کے پودے تھے- گرمیوں کے موسم میں یہ پھلوں

نور کمال شاہ

سے ڈھک جاتے تھے۔ دادا جان کیاریوں میں گوڈی کرتے؛ پودوں کو پانی ڈالتے اور اردگرد سے زرد مردہ پتے ہٹا دیتے تھے۔ گلاب کے پودوں میں بھی ہر وقت تازہ پھول کھلے رہتے۔ سکول سے چھٹیاں ہوتیں تو میں بھی صحن میں پہنچ جاتا۔ ہم پھل توڑتے؛ بلند شاخوں سے پھل اتارنے کے لیے وہ مجھے اپنے کندھوں پر سوار کر کے اونچا اٹھاتے اور میں پھل توڑ لاتا۔ زیادہ تر پھل وہ مجھے ہی کھلاتے؛ بس ایک آدھ دانہ خود کھا لیتے۔ سکول سے واپس لاتے ہوئے وہ مجھے آئس کریم بھی ضرور کھلاتے۔

فارغ وقت میں یا کبھی کبھی رات کو سونے سے پہلے دادا جان مجھے کہانیاں بھی سناتے تھے جو زیادہ تر ان کے اپنے متعلق یا ابو جان کے پچھلے زندگی سے متعلق ہوتی تھیں۔ اپنے گھر، دادا جان، دادی اور ابو کے بارے میں ساری معلومات مجھے ان ہی کہانیوں سے معلوم ہوئی تھیں۔ کس قدر مشکل وقت گزار آئے تھے دادا جان، کتنی مشکل سے یہ چھوٹا سا مکان بنایا تھا انھوں نے اور ابو جان کی خاطر اپنی ضروری خواہشات کی کتنی قربانیاں دی تھیں انھوں نے، یہ سب کچھ مجھے ان کہانیوں سے سمجھ آیا تھا۔

ابو جان چھٹی کے بعد دادا جان کے پاس ضرور آ بیٹھتے اور ڈھیروں باتیں کرتے رہتے۔ امی البتہ یا تو انہیں زیادہ وقت دے نہیں پاتیں یا گھریلو امور میں خود کو بے حد مصروف دکھا کر ذرا سائیڈ پہ رہنے کی کوشش کرتیں۔ کھانا بھی اکثر میرے ہاتھ سے بھیجتیں مگر دادا جان نے کبھی اس کا برا نہیں منایا۔ زمانے کا سرد گرم سہہ کر ہی دادا جان یہاں تک پہنچے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ بس باقی زندگی کسی طرح سکون سے بسر ہو۔ چنانچہ وہ ابو امی کے معاملات سے زیادہ سروکار نہیں رکھتے تھے۔ مگر وقت کہاں ایک سا رہتا ہے۔ میری بڑھتی عمر کے ساتھ مسائل پیدا ہوتے گئے۔ اب میں پانچویں چھٹی کلاس تک پہنچ چکا تھا۔ اب تک تو میری کتابیں کاپیاں دادا جان کے کمرے میں رکھی جاتی تھیں اور میں وہاں بیٹھ کے سکول کا کام کیا کرتا تھا مگر اب چونکہ میں بڑا ہو چکا تھا سو اب ہمیں ذرا بڑے کمرے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ امی جان کی خواہش پر دادا جان کو ہمارے والے چھوٹے کمرے میں شفٹ کیا گیا اور میں کتابوں سمیت امی ابو کے ساتھ دادا جان والے بڑے کمرے میں آ گیا۔ آٹھویں جماعت تک معاملات اسی طرح چلتے رہے مگر آٹھویں جماعت میں پہنچنے کے بعد امی نے محسوس کیا کہ مجھے اب الگ کمرے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ابا جان کے سامنے تجویز رکھ دی گئی کہ "کیوں نہ دادا جان کو گیٹ کے پاس والے کمرے میں منتقل کر دیا جائے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں مہمان بھلا آتے کب ہیں۔ بچے کی وجہ سے دادا جان کے آرام میں ویسے بھی خلل پڑتا ہے تو دوسری طرف خود بچے کی پڑھائی بھی متاثر ہو رہی ہے"۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ابا جان اس

بات پہ راضی نہیں ہیں مگر انھیں مجبوراً یہ تجویز ماننی پڑی اور یوں دادا جان دوسرے کمروں سے پرے گیٹ کے قریب واقع بیٹھک میں منتقل ہو گئے۔ انھوں نے کوئی شکایت نہیں کی اور نہ ہی کوئی گلہ کیا، بس خاموشی سے اپنا سامان اٹھایا اور بیٹھک میں چلے آئے۔

اب دادا جان اور ہمارے درمیان فاصلے پیدا ہو چکے تھے۔ بیٹھک والا کمرہ دوسرے کمروں سے الگ، مکان کے صدر دروازے کے پاس بنا ہوا تھا۔ اس سے آگے صحن شروع ہو جاتا تھا۔ صحن کے پار دوسرے دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ پڑھائی اور امتحان کی تیاری کے نام پر اس کمرے میں میرا آنا جانا پہلے ہی محدود کر دیا گیا تھا۔ ابا جان سب کچھ دیکھ رہے تھے مگر شائدان کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس ہونی کو روک سکیں۔ ندامت اور شرمندگی البتہ ان کے چہرے سے واضح جھلکتی نظر آتی تھی۔ امی جان اب کافی مطمئن اور پُرسکون دکھائی دے رہی تھیں۔ بڑھاپے اور کمزوری کے باعث دادا جان کے لئے گھر سے زیادہ باہر آنا جانا بھی اب ممکن نہیں رہا تھا۔ گھر کے اندر ہی اکیلے پڑے رہتے۔ دن میں ایک آدھ بار ابو ان کے پاس چکر لگا آتے اور کبھی کبھار میں اس طرف نکل جاتا۔

وہ خاموش ہو چکے تھے۔ بہت کم بولتے تھے اور اپنی چارپائی پہ پڑے اوپر چھت کو تکتے رہتے۔ ایک بڑے سمندر کی طرح اپنی گہرائی میں گم خاموش اور پرسکون مگر نہ جانے وہ اپنے اندر کتنے منہ زور طوفان چھپائے ہوئے تھے اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہو رہا تھا۔

تنہائی نے ان کی صحت کو متاثر کرنا شروع کیا اور وہ مختلف عارضوں کا شکار رہنے لگے۔ اکیلا پن خود ہی سب سے بڑی بیماری ہے۔ شدید درد سر، بخار، نزلہ، زکام اور کھانسی سب رفتہ رفتہ اس کے وجود کو کھانے لگے مگر اصل میں ان کا روگ کچھ اور تھا جسے اس وقت ہم سمجھ نہیں پا رہے تھے یا جان بوجھ کر ان جان بن بیٹھے تھے۔ دوا دارو آتا رہا گھر میں۔ انھیں متعدد بار ڈاکٹر کے پاس بھی لے جایا گیا مگر ڈاکٹر شائدان کے مرض کی تشخیص سے قاصر تھے۔

مہینے بھر کے اندر ہی ان کی ہمتیں جواب دے گئیں۔ وہ حوصلہ ہار گئے۔ انھیں کیوں اور کس کی خاطر جینا تھا۔ وہ اپنی زندگی، بری بھلی جو اور جیسی بھی تھی جی چکے تھے۔ ایک مہینے کے اندر ہی انھوں نے ہم سے منہ موڑ لیا اور ایک صبح کو خاموشی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے ہمارے لئے ایک اور کمرہ خالی کر کے ابدی نیند سو گئے۔ ابا اس دن بالکل خاموش تھے۔ انہیں تو رونا بھی نہیں آ رہا تھا؛ امی البتہ خوب دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھیں۔ محلے کے خواتین کی تسلی ان کے کئے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ شائد انہیں بہت دکھ پہنچا تھا۔

دادا جی کے انتقال کے چوتھے روز امی نے ملازمہ کو اس کمرے کی صفائی پہ لگا دیا اور خود بھی رگڑ رگڑ کے فرش و فرنیچر کو دھویا پونچھا۔ شام تک وہ کافی تھک چکی تھیں مگر کمرہ چمک اٹھا تھا!!!۔

☆☆☆☆☆

سیلا دیوی [ہارر فکشن]

صبا ممتاز بانو

شام تاریکی کا پیرھن اوڑھے جنگل میں بھاگتی پھر رہی تھی۔ ماحول کا سکوت اب غیر مرئی مخلوق کی آوازوں سے دفن ہو رہا تھا۔ وہ رات ہونے سے پہلے پہلے اس مندر تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یہ مندر شہر کے قدیم مگر ویران حصے میں واقع تھا۔

وہ ایک تحقیقاتی رپورٹر تھا۔ اس سفر پر وہ اکیلا ہی نکلا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اس مندر میں چاند کی چودھویں رات کو گھنٹیاں خود بخود بجتی ہیں۔ بے قرار روحوں کی صداؤں سے سے شاخیں لرزنے لگتی ہیں۔ پتے شاں شاں کی تیز ہواؤں میں اپنے وجود کو سنبھالنے کی کوشش میں ناکام ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ درختوں کے بیچوں بیچ سائے چلتے ہیں اور جونہی کوئی شکار ان کو نظر آتا ہے۔ وہ سب اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جسم سے سارا خون نچوڑ کر اس کی سرکٹی لاش کو درخت پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

اس رات تو کوئی بھی ہمت نہیں کرتا تھا کہ سیلا دیوی کے مندر تک جائے۔ اس کے باوجود اس نے کفن سر پر باندھ کر یہ بیڑا

اٹھایا تھا۔ جوں جوں وہ مندر کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ جسم میں ارتعاش ایسا تھا جیسے کوئی بلا اس سے چمٹ گئی ہو اور اب اس کے وجود سے کھیل رہی ہو۔ اس کا دل چاہا کہ وہ واپس پلٹ جائے۔ سیلا دیوی کون ہے۔ کیا چاہتی ہے۔ اس قصے کو گولی مارے۔ اس کے قدموں نے مٹی سے لپٹ کر اپنا دکھڑا رویا لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی اور ان کو چلتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تو مرنے یا مارنے کے سفر پر نکلا تھا۔

جونہی وہ مندر کے قریب پہنچا۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے یہاں روحوں کا میلا سجا ہوا ہے۔ تاریکی میں کانوں کو پھاڑ دینے والا شور ایسا تھا کہ جیسے زمانے کی ستائی ہوئی روحیں یہاں اکٹھی ہو کر ماتم کر رہی ہوں۔ اسے ان کی شکلیں تو نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن خوفناک ہیولوں کے رقص سے زمین پر ان کے قدموں کے نشان ضرور دکھ رہے تھے۔ وہ سب لہو میں تر بتر تھے۔ اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اس نے کچھ منتر پڑھ کو خود کو اپنے تئیں محفوظ کیا اور ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا۔ ٹھیک اسی لمحے کوئی چیخا اور ایک لمبے سے نسوانی ہاتھ نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ہوش آیا تو مندر کے فرش پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اسکے وجود پر ناخنوں کی خراشیں تھیں۔

اس روشن رات میں ایک کفن پوش حسین لڑکی سر کٹی ہوئی لاشوں سے سجی دیوار کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے لمبے بال پشت پر لہرا رہے تھے۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور اس لڑکی کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن یہ کیا؟۔ ڈھیر سارے سر بریدہ وجود اس کے پاؤں کو لپٹ گئے۔ وہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ وہ سمجھ گیا، یہی سیلا دیوی تھی۔ سیلا دیوی جو اب تک کئی جانیں لے چکی تھی۔ جس کے خوف سے لوگ یہاں آنے سے لرزتے تھے۔ یہ تو وہ تھا جو سر پر کفن باندھ کر نکل پڑا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے والی دیوار پر کچھ متحرک تصویریں ابھرنے لگیں۔ سیلا دیوی کی پشت ہی اسے نظر آ رہی تھی۔

”یہ دس برس پہلے کی بات تھی جب پانی عذاب بن کر زمین پر برسا تو لوگ در بدر ہو گئے۔ گاؤں کے گاؤں بہہ گئے۔ مضبوط گھر والوں نے گھر کی چھتوں پر پناہ لے لی تھی جبکہ کمزور گھر اپنے ساتھ مکینوں کو بھی بہا کر لے گئے تھے۔ وہ بھی پانی میں بہتا ہوا اپنا وجود سنبھالے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔

جس کو جہاں پناہ ملی تھی۔ اس نے وہیں پر

بسیرا کر لیا تھا۔ رات پوری طرح چھا چکی تھی۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسمان ابھی تک پانی برسا رہا تھا۔ زمین تو پہلے ہی پانی پانی ہو چکی تھی۔ ایک حسین اور نوعمر دوشیزہ سڑک کے کنارے کھڑی رو رہی تھی۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ چڑھتی جوانی اس کے وجود سے جھلک رہی تھی۔ اس لڑکی نے رو رو کر اسے آوازیں دیں۔

"رک جاؤ، رک جاؤ، میری مدد کرو۔ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پانی کے ریلے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ مجھے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دو۔ پانی نے میرے بوڑھے باپ اور ماں کو بھی نگل لیا ہے۔ ان کی لاشوں کو پانی پر تیرتے ہوئے دیکھ کر بھی میں کچھ نہیں کر سکی۔

"کیا کر سکتی ہوں میں لیکن تم تو کر سکتے ہو۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس پانی کے گھنے جنگل میں گم ہونے سے بچا سکتے ہو۔"

وہ معصوم صفت لڑکی مجھے فرشتہ سمجھ کر پکار رہی تھی اور میں اس وقت نہ فرشتہ تھا اور نہ ہی شیطان۔ میں تو ایک انسان تھا جو مصیبت کے وقت اتنا خود غرض ہو جاتا ہے کہ اپنی جان سے زیادہ کسی کو بھی عزیز نہیں سمجھتا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور منہ موڑ کر پانی سے لڑتا ہوا اپنی منزل کی جانب بڑھ گیا۔ اس لڑکی کی آوازیں دور تک میرا پیچھا کرتی رہیں۔ پھر میں ان آوازوں سے دور ہوتا چلا گیا۔ بھلا میں اس وقت کر بھی کیا سکتا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں اپنے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سب مکین محفوظ تھے۔ ان کو دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔

رات گزر گئی۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ پانی اپنی بادشاہت کھو بیٹھا تھا۔ اب زمین بھی پانی سے خالی ہو جانا چاہتی تھی۔ زندگی نے ہلچل کرنا شروع کر دی تھی۔ میں نے بھی دفتر کی راہ لینے کی ٹھانی۔ دفتر پہنچتے ہی میں نے شام کا اخبار اٹھایا۔ پہلے صفحے پر ہی ایک تصویری خبر نے مجھے چونکا دیا۔

ہاں، یہ وہی کل رات والی حسین نوعمر کلی تھی جس کی کچھ بھیڑیوں نے عزت لوٹ کر اسے ننگے بدن پانی میں پھینک دیا تھا۔ اس کے جسم کی حالت سے اس کے ساتھ کی جانے والی وحشت اور بربریت کا پتا لگتا تھا۔ تصویر میں اس کی کھلی آنکھوں سے اس کی بے بسی جھلک رہی تھی۔ مجھے اس کا ہاتھ لہرا لہرا کر پکارنا اور دہائی دینا یاد آیا۔ پھر اس کے بعد میں کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہا۔

"کاش، میں اس لڑکی کو اس رات بچا لیتا۔ میری وجہ سے اس کی عزت خوار ہوئی۔ وہ

جان سے گئی۔ ایک مرد نے برستے ہوئے پانی سے بچنے کے لیے اس کی مدد نہیں کی۔ دوسرے مردوں نے برستے ہوئے پانی سے فائدہ اٹھا کر اسکی عزت کو تار تار کر دیا۔"

پچھتاوے کی یہ رات بھی گزر ہی گئی۔ اگلے دن مجھے پھر ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ سفر چلتا رہا۔ ماضی کے قصے حال کے واقعات اور مستقبل کی تمناؤں میں گم ہو گئے۔

اب آج دس برس بعد میں ایک مندر میں اسی لڑکے کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم کی داستان کو سامنے کی دیوار پر دیکھ رہا تھا۔

پہلے منظر میں تو صرف میں تھا اور وہ تھی جو میری روح کو جھنجھوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسرے منظر میں تین بھیڑیے جو اس کے جسم کو نوچ رہے تھے۔ ایک برہنہ نسوانی وجود سے ہر کوئی اپنے اپنے انداز کا کھیل کھیل رہا تھا۔ وہ سب ہی تو سب کچھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان وحشی بھوکے کتوں سے جان بچانے کی کوشش میں اپنے جسم کی بچی کھچی جان بھی نکالنے میں سر پٹخ رہی تھی۔ تیسرے منظر میں اس کی لاش پانی میں تیر کر اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب مانگ رہی تھی۔ پانی کی ارزانی کے سامنے لہو کی گرانی کی قدر ہی نہیں رہی تھی۔

دس برس پہلے کے اس منظر کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کیا سیلا دیوی کو اس کی تلاش تھی۔ وہ خود اس تک آ پہنچا تھا۔ وہ بے بسی کی شدت سے چیخا۔ تبھی کفن میں ملبوس سیلا دیوی نے اپنا رخ اس کی طرف موڑا۔ اس کا چہرہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ باہر درختوں کی شاخوں سے سائے لٹکے ہوئے تھے۔ تین خون آشام بھیڑیے سر کٹی ہوئی لاشوں کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انکے سر اس کی کھوپڑی کے گرد رقص کرنے لگے۔ پہلا مجرم تین مجرموں کے گھیرے میں تھا۔ کیا اس کا سر بھی تن سے جدا ہو جائے گا؟۔ ابھی تو وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کے جسم کا ماس ایسے اترنے لگا جیسے سیمنٹ دیواروں سے اکھڑتا ہے۔ وہ خوف ودہشت سے کانپنے لگا۔

جنگل میں روحیں خوشی سے قہقہے لگا رہی تھیں۔ خوف ودہشت کی اس فضا میں ایک ننگے بدن سے خون نکل رہا تھا جسے کٹے ہوئے سر اپنی زبانیں نکال کر چوس رہے تھے۔ جب خون نے ہاتھ جوڑ دیے تو پھر ننگی ہڈیاں سفوف میں تبدیل ہونے لگیں۔

سیلا دیوی نے اس سفوف کو اٹھایا اور پھونک مار کر اڑا دیا۔ اب وہاں نہ کوئی مندر تھا اور نہ سیلا دیوی۔

☆☆☆☆☆

گائے والا گوشت [مختصر افسانہ]

بے زر ایک دیہاڑی دار مزدور تھا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ معصومہ کی عمر پونے تین سال کے قریب تھی۔ بہت ذہین تھی اس نے اپنے ''دبو'' سے سوال کیا۔

" ابو یہ ہر گلی چوک اور منڈیوں میں بہت سے دنبے بکرے گائے اور اونٹ وغیرہ لوگ کیوں لے آئے ہیں؟

''بیٹی عیدِ قربان قریب ہے اس کے لیے لائے ہیں''

'' اچھا تو علی بھائی لوگوں کے گھر میں بھی میں نے ایک دنبہ دیکھا تھا کل--

''ہاں بچے وہ بھی قربانی کے لیے ہی لائے ہیں''

''ابو تو پھر ہم کب دنبہ لائیں گے؟

ابو نے ٹال مٹول کی کوشش کی مگر بیٹی کی تان اسی سوال پر ہی کہ ہم کب دنبہ لیں گے؟

دادی ماں بتا رہی تھیں کہ عید کے تو دو دن رہ گئے ہیں۔

''بیٹا ہم نے گائے کی قربانی میں حصہ ڈالا ہے۔ ہم دنبہ نہیں لے سکتے...''

معصومہ دنبے کی تکرار کرتی رہی کہ دنبہ لیں، میں اس کو پکڑوں گی، گھاس کھلاؤں گی، اس کے ساتھ کھیلوں گی۔ بالآخر عیدِ قربان کا دن آ گیا۔

دن گزرنے لگا ظہر سے عصر کا وقت ہونے لگا تو معصومہ بڑی معصومیت سے اپنے ابو کے گلے سے لپٹ کر پوچھا

''ابو ساتھ والے گھروں سے تو صبح کی گوشت پکنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ اب تو بہت دیر ہو گئی بہت بھوک لگی ہے۔ گائے کی قربانی والا گوشت تو نہیں آیا-----''

'' بچے تو مجھے باہر جانے دے گی تو میں بھی اپنے حصے کا گوشت لے آؤں گا''

تو پھر جائیں ناں---- مجھے تو بھوک بھی بہت لگ رہی ہے''

باپ آنسو بہاتا ہوا باہر نکلا--- وہ دکھی تھا کہ کسی رشتہ دار کسی ہمسائے کو خیال نہیں آیا-- سب نے قربانی کا گوشت اپنے اپنے فریجوں میں محفوظ کر لیا تھا---

وہ رات دیر تک سڑکوں پر پھرتا رہا--- کئی جگہ گوشت بٹ بھی رہا تھا مگر بانٹنے والے شاید اندھے تھے-- پھر جب وہ رات گئے گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اس نے شکر کی سانس لی کہ اس کی بیٹی سو گئی تھی--

☆☆☆☆☆

عاصم بخاری

حسن پرست [مائیکروفکشن]

''ایک بات کہوں تمھیں؟''

''ہاں ضرور!''

''تم بے حد حسین ہو۔''

''ہاں حسین تو میں ہوں، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔''

''لیکن کہتے ہیں کہ خوب صورتی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے؟''

''یہ کس گدھے نے کہا؟''

''ارے گدھے کب بولتے ہیں؟''

''بولتے تو ہیں پاگل۔ ہاہاہا''

''نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ یہ تو کسی دانشور کا قول ہے۔''

''اس گدھے سے مجھے کیا لگا؟ تم بس میری آنکھیں دیکھو۔''

''دیکھوں؟ ارے میں تو اس کی گہرائی میں ڈھوب گیا ہوں۔''

''ڈھوبے رہو، یہاں سے تمھیں کوئی نہیں نکالنے والا ہاہاہا۔''

''میں نکلنا بھی نہیں چاہتا۔''

''ویسے ایک بات بتاؤ: یہ میری بڑی سیاہ روشن آنکھیں، ہلالی ابرو، سرخ ہونٹ، میری سفید رنگت، میری خمیدہ زلفیں— کیا یہ سب تمھیں فسانہ لگتی ہیں؟ اور تمھیں لگتا ہے کہ ساری خوب صورتی تمھاری آنکھ کی ہے؟ میں حسین نہیں؟''

''ارے نہیں، میں نے ایسا کب بولا؟''

''ابھی تو بولا کہ وہ دان شور، کیا کہتے اس گدھے کو ------''

''ارے نہیں نہیں، تم خواہ مخواہ ناراض مت ہو۔ تم واقعی حسین ہو۔''

''تم میرے اتنے قریب کیوں آرہے ہو؟''

''تمھارا حسن مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ جیسے چاند اور پانی کی کشش۔''

''تو اور پاس آؤ نا، چاند اور پانی کا ملاپ ممکن نہیں ہے۔ تم کچھ اور نام دو''

''اچھا تو میں بلبل اور تم پھول، اور پاس آؤں یا اتنا کافی ہے؟''

''اور گنجائش بچی ہے کیا؟ تمھاری نیت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔''

''ہاں تمھیں دیکھ کر کسی کی بھی نیت خراب ہو سکتی ہے۔''

''ارے یہ کیا؟ تم نے میرے ہونٹ کیوں چومے؟''

''معذرت! خود کو روک نہ پایا۔''

''سارا تھوک لگا دیا ہے میرے ہونٹوں پر، ہونہہ''

(شیشے میں کھڑے شخص نے خود کلامی کرتے ہوئے خود کو چوما اور پھر مسکرا دیا)

عمار نعیمی

قانون

ہر اک شے کی، شادابی کا، وقت معیّن ہوتا ہے
حُسن، جوانی اور کشش کی
رعنائی کے جادُو میں بھی
تبدیلی تو ہوتی ہے

پچھلی رُت کے پھل ہوں یا پھر بن موسم کے پھول
دونوں ہی کے تازہ پن میں
فرق تو پڑتا رہتا ہے
اور کمی تو ہوتی ہے

فطرت کے قانون تو سب پر اک سے لاگو ہوتے ہیں
ان کے ہر اک رُوپ میں یعنی
یکسانی تو ہوتی ہے

کب یہ کس کی خاطر بدلے
کب یہ کس کے لیے، جُدا تھے!
وقت کا سکہ، جس پہ چلے نہ
ہم تم ایسے کون خدا تھے؟

امجد اسلام امجد

کیا کہیں

راہ بھٹکی ہوئی زندگی
کیا کہیں
کیسے ادبار تک آ گئی
کیا کہیں
اپنے دشمن کے مطلب کی
رفتار سے
قسط در قسط یہ خودکشی
کیا کہیں
شوق میلوں میں بھی
سوچ تنہائیاں
چھن گئی ہم سے سچی خوشی
کیا کہیں
ڈھیر ہی ڈھیر
تفصیلِ معلوم کے
رہ گئی نام کی آگہی
کیا کہیں
شاملِ شور
اپنا بھی نقدِ سخن
بوریوں بوریوں شاعری
کیا کہیں
ہم
خود اپنی نگاہوں سے بھی
گر چکے
ایسی پستی نہ دیکھی کبھی
کیا کہیں
غیر ہاتھوں میں ہیں
اپنے شام و سحر
کن حدوں آ گئی بے بسی
کیا کہیں
دوستوں درمیاں
بولتے تھے بہت
لگ گئی کیوں ہمیں خامشی
کیا کہیں
کیا کہیں
جاگتا ہے جو اندر کہیں
اُس سے کتنی ہے شرمندگی
کیا کہیں

جلیل عالی

6 ستمبر 1965 تاریخ ساز گھڑی

عجب گھڑی تھی
شب گریزاں کی کالی رت میں
اک آفتِ ناگہاں کھڑی تھی
وہ ساعتِ خونچکاں
اچانک سروں پہ اپنے گری پڑی تھی
غنیم۔ تاریکیوں سے مل کر
خبیث آلائشوں سے لتھڑی
شرارتوں پہ تلا کھڑا تھا
شرافتوں کا گلا دبانے
ہمارے ملی وجود کو وہ عدم کا رستہ دکھانے آیا
ہمارے قومی وقار کو وہ مٹانے آیا
وہ سوئے لاہور چل پڑا تھا
کہ اس کو زیرِ نگیں وہ کر لے
وہ شر کا جھنڈا بلند کر لے
عجیب چالوں میں گم ہوا تھا
وہ سم ہوا تھا
ہماری جانوں کو آ گیا تھا
وہ اپنی غیرت کو کھا گیا تھا
ہماری غیرت جگا گیا تھا
ہماری بیدار آنکھ
اس کے تمام حیلوں کو جانتی تھی
ہمیں پتہ تھا
ہمارا دشمن نہایت اسفل، نہایت ارذل
معاملات جہاں میں بدتر
وہ حشر ساماں حماقتوں سے
وہ بدقماشی سے، بدلحاظی سے
اپنے ہاتھوں سے خود مرے گا
ہماری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں
خباثتوں کی تماشا گر تھیں
حرارتوں سے ضمیر شعلہ فشاں ہوئے تھے
خیالی آتش فشاں ہوئے تھے
ضمیر کی ان حرارتوں سے
امید افزا تمازتوں سے
وہ ساعتِ خونچکاں
عزیزِ ایماں بنی تھی
کمالِ حفظ و اماں ہوئی تھی
ہماری خاطر سروں پہ اپنے
ردائے رحمت بھی تو تنی تھی
دلوں میں اپنے یہی ٹھنی تھی
کمین دشمن نہ جانے پائے
وہ منہ کی کھائے
رذیل چہرہ نہ پھر دکھائے
شکستہ پا ہو کے لوٹ جائے
خدائے حفظ و اماں نے اپنے خصوصی
فضل و کرم سے بڑھ کر
ہماری خواہش کی لاج رکھ لی
کمین دشمن نے موت چکھ لی

سید ریاض حسین زیدی

یومِ دفاعِ پاکستان

فصیلِ شہر پر جتنے محافظ ہیں
یقیناً رُتبۂ عالی پہ فائز ہیں
وطن کے چپّے چپّے کی حفاظت ان کے دم
سے ہے
ہواؤں پانیوں پر بھی حکومت ان کے
دم سے ہے

☆

فصیلِ شہر پر چوکس محافظ
جاں ہتھیلی پر لئے
میرے وطن کی پاک مٹّی کی حفاظت کا
فریضہ یوں نبھاتے ہیں
کہ اِس کے ایک اک ذرّے کی خاطر
وہ لہو اپنا بہاتے ہیں
خود اپنی جاں سے جاتے ہیں

☆

ہمہ وقت اُن کی جی داری
شبوں کو اُن کی بیداری
ہمیں محفوظ رکھتی ہے
مُسلسل یہ نگہبانی ہمیں مرکوز رکھتی ہے
اِنھی کے دم سے آئینِ محبّت کے
قرینے سارے نافذ ہیں

☆

فصیلِ شہر پر جتنے محافظ ہیں
یقیناً رُتبۂ عالی پہ فائز ہیں

☆

فصیلِ شہر پر جتنے محافظ ہیں
اُنہیں اپنا سلامِ والہانہ پیش کرتا ہوں
وہ سب جو رُتبۂ عالی پہ فائز ہیں
انہیں نذرِ عقیدت غائبانہ پیش کرتا ہوں

نسیمِ سحر

آپریشن

مریضہ کس طرح بچتی
پلایا نو مہینے خون
اپنی کوکھ میں موجود بچے کو
جنم کے وقت شامت
اک شفاخانے میں لے آئی
نہیں معلوم تھا اس کو
یہ مرگھٹ ہے
اسے پہلے مسیحاؤں نے
اوزاروں سے چیرا پیٹ کو کاٹا
برآمد ایک نومولود کر کے
اقربا سے داد بھی پائی
خوشی سے لے گئے وہ اپنے گھر خوشیاں
جو راس آتی نہیں ہم کو
کہ ہم نااہل ہیں شاید
مبارک بادیوں کا شور
تھمنے بھی نہ پایا تھا
کہ ممتا درد سے تڑپی
حواس اس کے رہے قائم
نہ ہوش اس کے
جراحت کے لیے لائی گئی واپس
اسے ہونا پڑا پھر تختۂ مشقِ ستم اتنا
کہ اس کو خون کی سو بوتلیں بھی
زندگی ارزاں نہ کر پائیں
بدن میں رہنے والی ایک قینچی جان لیوا تھی
مریضہ کس طرح بچتی

گلزار بخاری

نظم

عمر شبیر

خواب دیکھتا ہے

ایسے ہی جیسے

برسوں پہلے

خواب دیکھتا تھا

اور صبح و شام

تعبیروں کا تعاقب کرتا تھا

میرے اور عمر کے

خوابوں میں فرق ہے

میرے خواب اپنی ہیئت میں عام تھے

اور عمر شبیر

ڈیجیٹل خواب دیکھتا ہے

سوال کرتا ہے

خوابوں کی منطق پر گفتگو کرتا ہے

بابا! آپ خواب دیکھتے تھے

آپ کے خواب پورے ہوئے؟

مجھے اپنے خوابوں کے بارے

زیادہ علم تو نہیں

لیکن میں اُسے آدھا سچ بول کر

ٹال دیتا ہوں

کہ شاید میرے مکمل خوابوں

کی تعبیریں ادھوری رہ گئی ہیں

طلعت شبیر

بارشوں کے موسم میں

ریاض ندیم نیازی

بے قرار موسم میں
یاد کے جھروکوں میں
پھر تجھی سے ملنے کی
دل میں کتنی خواہش ہے
آج کل جولائی کی
پھر اداس شامیں ہیں
ان اجاڑ آنکھوں میں
زرد زرد راتیں ہیں
''بارشوں کے موسم میں''
ٹوٹ پھوٹ جاتا ہوں
جب بھی یاد آتے ہو
خود کو بھول جاتا ہوں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

صبح کے سرمئی اجالے تک
رات کا ہم سفر رہا تھا کوئی

تیرے لیے

[وطن کی محبت کی کہی گئی ایک نظم]

دوستی تیرے لیے اور دشمنی تیرے لیے
اب تو ہے مخصوص اپنی ہر خوشی تیرے لیے

تو نے مجھ کو جان دی، پہچان دی، اک شان دی
کیا میں دے سکتا نہیں اک زندگی تیرے لیے

زینت و زیبائی بھی قربان کر سکتا ہوں میں
اوڑھ سکتا ہوں بدن پر سادگی تیرے لیے

تیرے ہر ذرے میں بو دوں گا میں اپنی دھڑکنیں
دی گئی ہے مجھ کو میری زندگی تیرے لیے

تا کہ مہکاؤں میں اپنی سانس سے تیرے گلاب
روز مل جاتی ہے مجھ کو تازگی تیرے لیے

یوں تو میں اندر سے گھائل بھی ہوں اور مغموم بھی
پھر بھی میں نے اوڑھ لی ہے دل کشی تیرے لیے

تیری خاطر ذات سے باہر نکل آیا ہوں میں
لب پہ ہے مسکان، آنکھوں میں نمی تیرے لیے

میں تو وہ مغرور ہوں کہ جو کہیں جھکتا نہ تھا
یہ تو اپنالی ہے میں نے بے خودی تیرے لیے

میں کہیں سے لے کر آؤں، لے کر آؤں گا ضرور
میرے جلتے دیس امن و آشتی تیرے لیے

میرے دل کی، میرے گھر کی، میرے حرف و صوت کی
جس قدر ہے سب کی سب ہے روشنی تیرے لیے

یہ زمانہ کیا کرے گا کم خزانوں کو ترے
جب خدا ہی نے نہیں رکھی کمی تیرے لیے

بے ہلال و بے ستارہ اب نہ ہوگی کوئی شام
اپنے چہروں سے کریں گے چاندنی تیرے لیے

علمدار حسین

''ملاقات''

حضرتِ قیس مرے خواب میں آئے کل شب
حکم صادر ہوا تیرا میں قصیدہ لکھوں
میں نے غالب کا تصور میں سجا کر پیکر
ایک سو ایک دفعہ میر تقی میر پڑھا
حجرۂ سوچ میں تقدیس کا چھڑکاؤ کیا
عقل و دانش کے نہیں بس میں کہ تعریف کریں
سرِ خم ہاتھ بندھے
گردن ہے خمیدہ میری
میرے الفاظ ترے ہونٹ بنائیں کیسے
چشمِ حیرت تری مسکان سمجھ سکتی نہیں
خود فراموش ہوا ہوں میں تری سن کے ہنسی
تیرے ہاتھوں کی مہکتی ہوئی مہندی کی قسم
وہم و ادراک سے باہر تری دلکش آنکھیں
خواب زاروں سے علاقہ ہی نہیں ہے جن کا
بالیاں چوم کے رخسار پلٹ جاتی ہیں
اور کانوں میں مرے شہد کا رس گھولتی ہیں
پیرہن ایسے چپکتا ہے کہ اترے نہ کبھی

جسم پاکیزہ مسافت کے نشاں کا محور
اوڑھنی چھیڑ کے زلفوں کو سرک جاتی ہے
اور چراغوں کو اجالوں کا پتہ بانٹتی ہے
چوڑیاں رقص میں رہتی ہیں کلائی میں تری
ساز اور سوز کی حیرت کا مزہ لیتی ہیں
تیری انگشتری کمرے میں اجالا کر کے
میری تنہائی کی وحشت کا فسوں پھانکتی ہے
تیری پازیب کی چھن چھن کا ترنم... آہا
صبح کی خستہ سماعت کا بھرم رکھتا ہے
تو جو بولے تو ستاروں کی خموشی ٹوٹے
تیری باتوں کے اسیروں میں کبوتر بھی ہیں
میں نے ہدہد کی زبانی تری تعریف سنی
میں نے دیکھا ترے دیدار کو چڑیوں کا ہجوم
تیرے چہرے کی تلاوت یہاں اشجار کریں
سرمئی لمس کی حدت سے گریزاں ہو کر
سرنگوں شاخِ شجر تیرا سراپا کھینچے
ان کہی اور کہی ہونٹوں تلک آئے اگر

تیری توصیف میں ڈھلنے کی جسارت سے پرے
صبر کی راکھ ملے چہرے پہ اور گریہ کرے
پھول مرجھانے سے پہلے تجھے خوشبو سونپے
آسماں تاروں بھرے تھال نچھاور کر کے
ایسے چپ سادھ لے جیسے کہ ہُوا کچھ بھی نہیں
تیری ایڑی کی رگڑ سے کوئی سورج چمکے
تیری بالی کی چمک سے ہے قمر کی رونق
بُلبُلِ شہر تجھے اہلِ ہُنر کہتے ہیں
کہکشاں روز اُترتی ہے ترے آنگن میں
صُبح دَم پھول قطاروں میں کھڑے ہوتے ہیں
جس کو تُو چھو لے وہ گُل شاہِ گلستان ہوا
میں نے آنکھوں کے دریچوں سے صدائیں دی ہیں
میرے ہونٹوں نے یوں چومی تری نوکِ موگاں
اِن نشانوں کے مقدر پہ ہے نازاں اَسوَد
تیرے گھر تک کی مسافت میں نے ایسے کاٹی
تیرے قدموں کے نشاں پر مرے پاؤں نہ پڑیں
موسمِ ہجر میں راتوں کی طوالت توبہ
یہ ملاقات فرشتوں کو تیقن سونپے
ذہن و دل طوفِ عبادت کا ارادہ کر لیں

سطر در سطر مرے لب سے سخن جھڑنے لگے
چاہتا ہوں کہ مری عمر بسر ہو جائے
چاہتا ہوں میں
مگر
سوچ میں پڑ جاتا ہوں
مُختصر کِتنا ہے
تُجھ سے یہ مُلاقات کا دن

مُختصر کِتنا ہے
تُجھ سے یہ مُلاقات کا دن

دانش عزیز

زندگی آواز ہے

خامشی ہے گھُپ اندھیرا
خامشی تو موت ہے
سانس لینا بھی جہاں دشوار ہے
اور خوشیوں کا تصور باعثِ آزار ہے

موت کے چُپ چاپ منظر جھانکتے ہیں
سُونی سُونی کھڑکیوں سے
اب جہاں تازہ ہَوا جاتی نہیں ہے
بُھولی بسری
جانی پہچانی صدا آتی نہیں ہے

موت کے چُپ چاپ منظر جھانکتے ہیں
ایسے چہروں سے
بظاہر مسکراتے ہیں
خوشی کے گیت گاتے ہیں
مگر جو بے بسی کی
ایک جیتی جاگتی تصویر کو بھی پیش کرتے ہیں
جنہیں پڑھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا
مگر پڑھ کر بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا

موت کے چُپ چاپ منظر جھانکتے ہیں
اُن درختوں سے
جہاں چھاؤں رہی باقی
نہ آوازیں پرندوں کی
نہ کوئی سرسراہٹ اب ہے پتوں میں
کبھی سرسبز ہوتے تھے شجر سارے
مگر اب تو
فقط ڈھانچے کھڑے ہیں راستوں میں

موت کے چُپ چاپ منظر جھانکتے ہیں
خالی کمروں میں لگی
کچھ ایسی تصویروں سے
جن کے رنگ بھی اب اُڑ گئے ہیں
وقت نے اُن کی کشش محدود کر دی ہے
کبھی جو بولا کرتی تھیں
چُھپے ہیں اُن کے خدوخال میں جتنے بھی قصے
اُن کی گرہیں
دھیرے دھیرے کھولا کرتی تھیں

موت کے چُپ چاپ منظر جھانکتے ہیں
ایسی نظموں اور غزلوں سے
کہ جن کے لفظ تو زندہ ہیں
لیکن غم میں ہیں ڈوبے ہوئے ایسے
اگر کوئی اُنہیں پڑھ لے
تو وہ زندہ نہیں رہتا
وہ ہنستا کھیلتا انسان

پھر ویسا نہیں رہتا

مگر جتنے بھی ہیں چُپ چاپ منظر
رفتہ رفتہ تھک گئے ہیں
اور شاید
موت کی آغوش میں کہنے لگے ہیں
زندگی آواز ہے
باتیں کرو دیوار و در سے
اور تصویروں سے جو خاموش رہتی ہیں
درختوں سے
پرندوں سے
ہَوا سے
روشنی سے
اور اُن لوگوں سے خود جا کر
کرو باتیں
جو وجہِ زندگی ہیں
اور ملاقاتیں کرو اُن سے
جو آنکھوں کے لئے ہیں تازگی
دل کی خوشی ہیں

وقت کا رُکنا نہیں ممکن
بڑھو آگے
مِلو اُن سے
جو دل کی بات سُنتے ہیں
جو دل کی بات کہتے ہیں

گِلے، شکوے، شکایت کیا کریں
جب وقت ہی کم ہو
برائے نام ہو بس زندگی
اور ہر طرف غم ہو

اگرچہ ہم نے دیواریں گرادی ہیں اناؤں کی
ہمارے راستے میں جو بھی حائل تھیں
مگر اب کیا کریں ہم ایسے لوگوں کا
جنھوں نے کچی دیواروں کو پُختہ کر لیا ہے

چلو آؤ اگر کوئی نہیں ملتا
تو اپنے آپ سے ہی باتیں کرتے ہیں
خموشی توڑ دیتے ہیں
بہت چُپ رہ لیا ہم نے
بہت دکھ سہہ لیا ہم نے

ظہور چوہان

نثری نظم

کیاری میں خواب بوئے ہیں

شاید اگلے موسم میں ان پر بور آئے گا

اشکوں کی آبیاری پر بھروسہ تو ہے مگر

لگتا ہے زمیں زرخیز نہیں

سوچ کو دیمک لگ جائے تو

کینوس پر خیال کب اترتے ہیں

زندگی کی طرح تصویر بھی ادھوری رہ جاتی ہے

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شکل شکل زندانی، سحرِ بے رُخی کی ہے
آزروں کی بستی میں، دھُوم سامری کی ہے

کشمیری بچے کا نوحہ

مرے کھیتوں میں لوگ اب کام کرنے کیوں نہیں آتے؟
مرے ابو کھلونے شام کو اب کیوں نہیں لاتے؟
یہ کیسی رُت ہوئی بابا!
یہ کیسی رُت ہوئی بابا!
مری امی کی آنکھوں میں نمی سی آئی رہتی ہے
دُھوئیں کی کالی چادر سب گھروں پر چھائی رہتی ہے
یہ کیسی رُت ہوئی بابا!
یہ کیسی رُت ہوئی بابا!
دکانیں صبح دم پہلے کی طرح کیوں نہیں کھلتیں
وہاں گلمرگ میں غُنچوں کی کلیاں کیوں نہیں کھلتیں
یہ کیسی رُت ہوئی بابا!
یہ کیسی رُت ہوئی بابا!
بہت جلدی ہمیں اب لوٹ کر گلمرگ جانا ہے
بہت جلدی ہمیں سجدوں سے حضرت بل سجانا ہے
وہاں جانا ہے بابا، اب ہمیں ہر طور جانا ہے
وہ رُت کب آئے گی بابا، وہ رُت کب آئے گی بابا؟
یہ کیسی رُت ہوئی بابا!
یہ کیسی رُت ہوئی بابا!

راجہ عبدالقیوم

ساونی

ایک تو یہ رم جھم کا موسم دُوجے سولہواں سال
جینا ہُوا محال

انگ انگ نے رنگ ہے بدلا بدل گئی ہے چال
دھرتی پر مَیں پَیر رکھوں تو آ جائے بھونچال
حال ہُوا ہے ایسا میرا جس کی نہیں مِثال
جینا ہُوا محال

سُلگ رہا ہے انگ انگ نَس نَس میں جاگی پیاس
مُجھے دِکھائے دِن میں تارے پیا مِلن کی آس
ہُوا ہے کھلتا یوں باغی بُرا ہے میرا حال
جینا ہُوا محال

خواب کئی آنکھوں میں چھپائے دِل میں چھپائے راز
اِدھر اُدھر یُوں بھٹکوں جیسے بَن میں کوئی آواز
کِسی کا رستہ دیکھے جوانی رُوپ کے جھولے ڈال
جینا ہُوا محال

جوالا مُکھی سُلگائے تَن میں ٹھنڈی ٹھنڈی پُھوار
جہاں پڑے پرچھائیں میری دہک اُٹھیں انگار
رنگ مِری دھانی چُنری کا ہونے لگا ہے لال
جینا ہُوا محال

اُٹھے ہُوک ایسی سینے میں سانس مِری رُک جائے
کمر پہ چوٹی رستہ بھولی ناگن سی لہرائے
مُجھے مار ڈالے گا ساون چل کر کوئی چال
جینا ہُوا محال

چھوڑ کے تنہا بھری جوانی میں جو گیا پردیس
یاد مجھے جب اُس کی آئے دل پہ لگے یُوں ٹھیس
ہری بھری کھیتی میں چلائے جیسے کوئی کدال
جینا ہُوا محال

پیا بِنا سونے سی جوانی ہوتی جائے راکھ
پیا کی بانہوں میں ہو جسکی قیمت لاکھوں لاکھ
جیوتی کلش سی کایا میری ہونے لگی کنگال
جینا ہُوا محال

نیاز جیراجپوری

انمول

یہ لکڑی ہے
یہ بالکل عام سی لکڑی کا ٹکڑا ہے
فقط دو چار سکوں میں بڑھئی نے یہ خریدا ہے
مگر جب کاری گر اس کو تراشے گا
کرکٹ کا یہ اِک بلّا بنے گا۔۔۔
وہ کاری گر اسے دکان پر جب کم روپوں میں بیچ ڈالے گا
دکاں سے اِک کھلاڑی یہ خریدے گا
بہت ہی تھوڑے پیسوں میں
کرکٹ عالمی میلے میں وہ اِک میچ کے دوران میں
جب آخری اوور کی بالکل آخری ہی بال پر چھکا لگا کر
میچ کا پانسہ پلٹ دے گا۔۔۔
تو دنیا بھر میں چھا جائے گا وہ ہیرو۔۔۔
ہر اک جانب سے ہی داد و دہش کے پھول برسیں گے

یہ بلّا۔۔!
اب کے لکڑی کا کوئی معمولی سا ٹکڑا نہیں
بلکہ ہزاروں ڈالروں میں اس کی قیمت ہے

سنو!
سادہ سے معمولی سے یہ الفاظ ہوتے ہیں
جنھیں ہم روز سنتے ہیں
سعادت مند گھڑیوں میں
یہی الفاظ جب شاعر ادا کرتے ہیں
تو سچائیوں کا بول ہوتے ہیں
بہت انمول ہوتے ہیں۔۔۔

زعیم رشید

ایک لمبے انتظار کی موت

یہ ایک مختلف سا ریگ زار ہے
انوکھا سا
سفر بھی بے سمتی کے تعاقب میں ٹھہرا ہوا
یہاں پر
گم شدہ خواب کے مکیں تھے
کہاں غائب ہوئے
تیری میری کہانی کے
سبھی کردار
وقت کے اوراق جل کر، کہاں راکھ ہوئے

اب تو
نہ دھواں ہے
نہ جیت کے آثار کا جشن
نہ غم کی دیوار کا سایہ
نہ شکست سے مہکی ہوئی یاد
نہ رابطے کی سہولت کا فسوں
اگر کچھ تھا.....
شاید اب کچھ بھی نہیں
پھر بھی

دل پہ موہوم سی لکیر ہے
آنکھوں میں درد کی جھاڑی کے پھول
جیسے برفیلی ہواؤں کے ہونٹوں پر
دعا جمی ہو
جیسے نحوست کے سٹیشن پر
بلا ٹکٹ مسافر
آخری گاڑی کے انتظار میں کھڑا
خود کلامی میں مصروف ہو

امجد بابر

کھیتی

تمہاری عورت تمہاری کھیتی کہ جس طرح سے بھی چاہو
آؤ
میں سوچتا ہوں کہ میرے رب نے اس ایک آیت
کے لفظ "کھیتی" میں راز کتنے سمو دیے ہیں

بس ایک ٹکڑے زمیں کا مالک بھی جانتا ہے
فقط محبت کا بیج بونے سے فصل پکنے تلک
کے جتنے بھی سلسلہ وار مرحلے ہیں، وہ
مانگتے ہیں ریاضِ دہقاں
یہ صرف دہقاں ہی جانتا ہے زمیں کے
سینے سے اُگنے والی یہ فصل ہر دن
فقط توجہ کی چاشنی میں پلے بڑھے گی
وہ رازِ فطرت سے آشنا ہے،
وہ جانتا ہے گریز کرنے کا زہر کھیتی میں پھیل جائے
تو کونپلوں کو اُجاڑ دے گا۔
سو اپنی چاہت کی آبیاری سے روز مٹی کو سینچتا ہے
وہ اپنی کھیتی میں اُگنے والے
ہر ایک خوشے کو چاہتا ہے
پرندا تریں چرند لپکیں،
وہ بن کے نگراں ہر ایک ڈالی، ہر ایک
بالی سنبھالتا ہے،
نظر میں رکھ کے سنوارتا ہے
تمہاری عورت تمہاری کھیتی بجا اے دہقاں
مگر فقط ایک بیج بونے سے تم کو ہر پل
ہری ملے گی تو کم شناسی کی انتہا ہے
اسے بھی خواہش ہے روز دہقاں
اُسے توجہ کی کھاد ڈالے
نظر سے ایسا حصار باندھے کہ اُس کی جانب
ہوس میں ڈوبی نگاہ اُٹھنے سے پہلے سوچے
اُسے بھی چاہت کہ شام آئے تو اُسکا
دہقاں لبوں کے مرہم سے اُس کے دن
بھر کا درد ماتھے سے چُن کے سوئے
تمہاری عورت تمہاری کھیتی ضرور لیکن
نظر میں اُسکو سجا کے سینچو
تو دیکھ لینا تمہارے دستِ ہنر کی پیاسی، تمہاری داسی
تمہاری چاہت کے گیت گاتی ہوئی ملے گی
سو جس طرح سے بھی چاہو جاؤ یہ لہلہاتی ہوئی ملے گی
تمہاری عورت تمہاری کھیتی!

عاطف جاوید عاطف

خطوط

آصف ثاقب

واجب الاحترام عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

جانے کیا سوجی کہ ظہیر کاشمیری سے متعلق مضمون قلم بند ہو گیا۔ مضمون آپ کو بھیجتا ہوں۔ ظہیر کاشمیری پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ شاعری میں ان کا ایک مقام ہے۔ اپنے دور کے کسی بڑے شاعر سے وہ پیچھے نہیں۔ کمپوزنگ کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بدخطی ہی ایسی ہے۔ امید ہے میرا 4 اگست کا خط پہنچ گیا ہوگا۔ اب کے ''بیاض'' میں سلطان سکون کر دیکھ خوشی ہوئی۔

واحد سراج کی غزل بھی ہے اور تصور اقبال کی بھی۔ واحد سراج نظم بہت اچھی کہتے ہیں۔ واحد سراج اور تصور اقبال سے تحریری رابطہ ہے۔ عادل سعید قریشی کا مضمون خوب ہے۔ عادل سعید قریشی ہزارے کے نامور افسانہ نگار ہیں۔ وہ اردو اور ہندکو افسانے لکھتے ہیں۔ سیاسی ابتری سے پریشان ہیں۔ ہمارے سیاستدان سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں۔ جو زبان پر آتا ہے بک دیتے ہیں۔ سر پیر بغیر کی گفتگو کرتے ہیں۔ آپ نے اگست کے ''بیاض'' میں مجھے عزت دی ہے۔ یہ آپ کی مہربانی ہے۔ خالد احمد مجھے ''بیاض'' میں لائے تھے۔ کئی برس سے میں ''بیاض'' سے متعلق ہوں۔

خالد احمد پر مضمون بھیجا تھا۔ شاید عنوان ''کون؟ خالد احمد'' آپ کے بھانویں میں نہیں آیا۔ عنوان ''خالد احمد پیارا شاعر'' رکھ دیں۔ مہربانی ہوگی۔

خیر اندیش

عمران منظور

محترم جناب آصف ثاقب!

خالد احمد پر آپ کا مضمون ہمیں موصول نہیں ہوا۔ شاید ڈاک کی نذر ہو گیا ہو۔

برائے مہربانی دوبارہ بھیج دیں۔ نوازش ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)

جمیل یوسف

جناب عمران منظور صاحب

سلامت رہیں۔

شعر و ادب سے دلچسپی بلکہ شیفتگی والوں کے لیے آپ ''بیاض'' کی صورت میں ہر ماہ ایک قیمتی تحفہ بھیجتے ہیں۔ اور ہزاروں اہلِ ذوق خواتین و حضرات کو خوش وقت کرتے ہیں۔ میرے دل سے تو یہی دعا نکلتی ہے۔

اے وقتِ تُو خوش کہ وقتِ ما خوش کر دی

اب اس زمانے میں اور اس موسم میں ادبی تقریبات میں جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ''بیاض'' جیسے رسائل و جرائد سے گھر بیٹھے بٹھائے تقریبات میں شرکت کا مزہ ملتا ہے۔ خاص کر اس کا حصۂ غزل تو مجھ ایک بھرپور مشاعرہ لگتا ہے۔

اس دفعہ شاعرِ بے مثال جناب سلطان سکون کی شرکت سے اہلِ مشاعرے کی اہمیت اور رونق بڑھ گئی ہے۔ سلطان سکون منفرد لب و لہجے کے ایک باکمال شاعر ہیں۔ دوسری غزل جس کی میں داد دینا چاہتا ہوں وہ ناصر علی سید کی ہے۔ جناب سلطان سکون کی غزل اور جناب ناصر علی سید کی غزل پر شاد عظیم آبادی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

در مضمون کوئی یوں باندھ لے کے شاد مشکل ہے
سلیقہ انتہا کا چاہیے موتی پرونے میں

نسیم سحر

برادرم عمران منظور۔ سلام مسنون، آپ کو بھی اور ادارۂ بیاض کے تمام اراکین کو بھی۔
شاید آپ کے علم میں ہو کہ "بیاض" میں لکھنے والے ایک مستقل کھاری کرنل (ر) سید مقبول حسین بھی رخصت ہو گئے۔ بس کل چلا ڈنکا ہوا ہے اور دل رائج مواصلات تیز ہونے کے سبب مسلسل کئی شہروں اور ملکوں سے ایسی خبریں ملتی رہتی ہیں۔
ابھی ابھی فیس بک پر دیکھا ہے کہ سینئر شاعر اور کالم نگار جناب اختر شمار شدید بیمار ہیں اور اس وقت آئی سی یو میں داخل ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دوست اختر شمار پر رحم فرمائے۔
میرے علاوہ بھی بہت سے دوست ان کے لیے مسلسل دعائیں کر رہے ہیں۔ خدا کرے اللہ تعالیٰ اپنے کسی پیارے کی دعا قبول فرما لے۔
جناب سلیمان عبداللہ ڈار کا دانش بمعرفت سے بھرپور جو بھی مضمون شائع ہوتا ہے اسے بار بار پڑھتا اور بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس مرتبہ بھی ان کا مضمون نہایت چشم کشا اور دل کشا تھا۔ اس کا اختتامی فقرہ تو واقعی حاصل تھا کہ "اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ ہمارے اندر بہت سی کوتاہیاں موجود ہیں مگر جس راہ کا میں نے اس تحریر میں ذکر کیا اس پر چلنے کی کوشش رب کریم سے محبت کے دلفریب اور دیدہ زیب رشتے کا دروازہ کھول دیتی ہے، دروازے کھل جائیں تو راہیں آسان ہو ہی جایا کرتی ہیں"۔ اللہ کریم ہم سب کے لیے یہ رحمت کے دروازے کھولے اور ہماری راہیں آسان کرے۔
محترمہ مشرف عشرت صاحبہ کے سفرنامہ "ولایت چلتے ہیں" پر ڈاکٹر فارغ ترانی کا مضمون بہت مختصر لگا۔ شاید یہ اس کتاب کا طلب ہو، ذرا تفصیلی ہوتا تو اچھا ہوتا کہ ہمیں اس سفرنامے کے بارے میں کچھ زیادہ آگاہی ہو جاتی۔
"معتبر شاعرہ منصورہ احمد کی ہمہ جہت شخصیت" پر جناب ظفر معین بلے جعفری کے مضمون کی دوسری اور آخری قسط تفصیلی اور موضوع کی تکمیل کر رہی ہے۔ ظفر معین بلے جعفری نے بڑی احتیاط سے کچھ باتیں اس انداز میں بیان کی ہیں کہ ان پر حرف بھی نہیں اٹھایا جا سکتا اور کچھ شعرا یا قارئین کو جو کچھ پہلے سے معلوم ہے اس میں یہ معلومات مزید اضافہ کر رہی ہیں۔ یہ بھی مدنظر رہے کہ "خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم" کے تحت انھوں نے اپنی احتیاط تحریر سے محترمہ ناہید قاسمی کے دل کو بھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ بہت خوب۔ "مشاعرے کی روایت اور سلمیٰ شاعری کا رجحان" کے مباحث پر برادرم فیصل زمان چشتی کی تحریر کردہ رپورٹ بڑی تفصیلی تھی اور مشاعروں کی زوال آمادہ اقدار پر مشاعروں سے وابستہ شخصیات نے خوب روشنی ڈالی ہے۔
افسانوں میں اس عہد کے سرپرست افسانہ نگار جناب ابدال بیلا کا "جوئی نیز بر اور انطوئی" کے عنوان سے افسانہ کل شمارے کی جان تھا۔ ان کے بچے تلے بھلے اندر معانی کی کئی سطحیں لیے ہوتے ہیں۔ جناب غم رضوی کا افسانہ "آخری امیدوار" بھی ایک ضرورتمند خاتون کی قربانی ظاہر کرتا ہے جسے ملازمت کی شدید ضرورت تھی مگر ایک اور اپنے سے بھی زیادہ ضرورتمند لڑکی کو دیکھ کر وہ انٹرویو دینے سے دستبردار ہو کر باہر نکل جاتی ہے۔ افسانے کی بنت اور پلاٹ کی بھول نے بڑا متاثر کیا۔
نظموں میں سید فخر الدین بلے، امجد اسلام امجد، تابش کمال، طالب انصاری، نائلہ راٹھور، مسعود بشیر، صغیر احمد صغیر اور اعجاز رضوی کی نظمیں اچھی لگیں جبکہ درمانہ توقیر خان کی نثری نظم "پہاڑ سے کاٹا۔ زندگی" بھی اپنے موضوع پر ایک تخلیقی بیانیہ ہے۔
حمد و نعت، سلام کے کچھ چنیدہ اشعار لکھ رہا ہوں:

شام رنگین ہے اطلسوں سے — اس کی یادوں سے دل سجاتا ہے — آصف کاتب
اک کیف، اک خمار سا دیوار و در میں ہے — ملتا ہے جیسے سارا حرم ہے طواف میں — سرور حسین نقشبندی
یہ فتح مکہ کے فاتح کا فیصلہ ہے عفو — جو تم سے مانگے اماں، ہے اماں اسی کے لیے — اکرم ناصر
رات دن جس کا وظیفہ ہو ثنائے خواجہ — اس کے انفاس سے آتی ہے ہمیشہ خوشبو — محمد یٰسین قمر

فنا سے دست و گریباں تھا زندگی کا وقار
ملا رہی تھی ہوس خاک میں خودی کا وقار
سوال عظمتِ خاکی تھی آدمی کا وقار
عروج آدم خاکی کی انتہا کے لیے
حسین ہی کی ضرورت تھی کربلا کے لیے
سید فخر الدین بلے

کبھی پڑھ کر انہیں غم سرا کے مرثیے دیکھو — تمہیں کس نے کہا دل پر جمی کائی نہیں جاتی — جلیس عالی
تیرے کتب گل پہ ہے لمس قدوم حسینؑ — رو گزر کربلا، تجھ پہ ہزاروں سلام — خالد علیم

غزلوں میں سے صرف وہی اشعار یہاں درج کر رہا ہوں جو اچھوتے موضوع یا ندرت الفاظ کے لحاظ سے مجھے اچھے لگے:

اک دھندلکے میں عمر بیت چلی — تیرگی ہم سے روٹھتی ہی نہیں

اے دیارِ وصالِ یار، بتا — ہجر کس آستاں سے ملتا ہے — خالد احمد

آخری عمر کا ہے عشق خدا خیر کرے — جان لے جائے گا ورنہ تو یہ جانے کا نہیں — سلطان سکون

برپا ہو انقلاب حقیقی تو بات ہے — میرے وطن میں ایسا کوئی سال ہو تو ہو — حسن عسکری کاظمی

آنکھ کی قید میں رکھے آنسو — گرچہ دکھ بے حساب تھا کل شب — ناصر علی سید

ہاتھ اور دل جو بہم ہوں تو اثر لازم ہے — ہاتھ اٹھتے ہی تلقی ہے دعا اندر سے

ایک شب خواب میں دیکھا تھا مدینہ میں نے — جب سے آتی ہے مدینے کی ہوا اندر سے — اقبال مرویہ

پہاڑ اپنے اندھیرے سے بھرا ہے — کھڑی ہے اک گلہری روشنی میں — واحد سراج

اے کوچۂ شام ذرا غور سے سنو — لوگ سناں پہ جاری تلاوت کے سلسلے — احمد جلیل

ہم کتنے خوش گمان تھے اب جا کے یہ کھلا — گلدان میں تھے آپ کے سب کاغذی گلاب — سعد اللہ شاہ

چاند آئے گا دیکھنے تجھ کو — تم مری جان دیکھتے رہنا — آغا نثار

تقاضا وصل کا کس نے کیا تھا — مجھے تو ہجر دم بھر چاہیے تھا — جمشید چشتی

عدالتیں ہوں مساجد ہوں یا کوئی بازار — یہاں ضمیر کا سودا کہاں نہیں ہوتا — راحت سرحدی

میں نے بس مشقِ سخن کے لیے لکھا میثم — اور غزل ہو گئی منسوب غزالِ خوش رو — میثم نقوی

عشق ہونے کا تماشا نہیں کرنا شاہد — عشق میں ایسی عزاداری نہیں کرنی ہے — افکار شاہد

لوگ اک اور زمانے کی خبر چاہتے ہیں — اور میں آج کا اخبار لیے پھرتا ہوں — اسحاق وردگ

ہو رہا ہے کئی زبانوں میں — ترجمہ میری بے زبانی کا — شاہد ماکلی

اپنے دل کے بوجھ کو بھاری نہیں ہونے دیا — میں نے خود پر عمر کو طاری نہیں ہونے دیا — رخشندہ نوید

یہ وقت باغ سیکھنے کا ہے، جگاؤ اسے — جو شخص خواب سرا میں قیام کر رہا ہے — صائمہ آفتاب

انگلیاں کٹ گئیں فنکار کی خاموشی سے — کیا سنا ہے کبھی تم نے کسی معمار کا دکھ — طلعت شبیر

کھل گیا ہے زہر کیوں پھر آپ کی زبان میں — یک گئے ہیں شہد کے تمام مرتبان کیا — تصور اقبال

کسی کے ہاتھ میں ہے ڈور میری — یہ کٹھ پتلی ناچتی ہے، میں نہیں ہوں — فیض رسول فیضان

خدا مجھے بھی عطا کر دے ایسے دوست کہ جو — چراغ بجھنے پہ خیمہ نہیں بدلتے ہیں — ازور شیرازی

ہر دفعہ خواب بنا جاتا ہے پہلے سے خدا — مسئلہ خواب کی تعبیر میں آ جاتا ہے — امر مہکی

میں بھلا تکمیل کے زینے چڑھوں کیوں — میں مکمل ہوں جیا، آدھی نہیں ہوں — جیا قریشی

جہاں پہ سوختہ جذبات رکھے جاتے ہیں — ہر ایک دل میں کہیں سرد خانہ ہوتا ہے — عطا الحسن

آگہی ایک مستقل دکھ ہے — اور اس کا ثمر اداسی ہے — احمد محمود

پھر شعورِ ذات کے ہر طاقچے میں رکھ دیے — جتنے استفہام ہیں اور جتنے بھی ابہام ہیں — طیم اطہر

صرف تم کو منانے کی خاطر مجھے — پھول سے ایک تتلی اڑانی پڑی — مہر علی

دوست، میں پیدائشی شاعر نہ تھا — پھر تمہارے ہجر کے کھاتے کھلے — حسنین آفتاب

کون اس رمز کو سمجھے کہ ترے لہجے میں — جلتی بجھتی ہوئی سگریٹ کا دھواں بولتا ہے — ارسلان ساحل

تم سمجھ نہ پاؤ گے کیسے تم کو سمجھائیں — اس غریب خانے میں کس کو آ کے رہنا تھا — نوید صادق

یہ کیسے دکھ ہیں جو گھیرے سے بندھے ہوئے ہیں — سفر کے زائچے زنجیر سے بندھے ہوئے ہیں — توقیر احمد

وگرنہ شہر میں مشہور تھے لطیفے مرے — تو پہلا شخص ہے جس نے مجھے اداس کیا — فقیہہ حیدر

گذشتہ ماہ ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان شاعر احمد محمود کی کتاب پر اپنا تبصرہ روانہ کیا تھا، شاید ابھی اس کی باری نہیں آئی۔

طالب انصاری

برادرم عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

"بیاض" کا شمارہ بابت اگست 2022 موصول ہوا۔ اس بار رسالے کی وصولی قدرے تاخیر سے ہوئی۔ اس پر محرم الحرام کے مہینے میں مصروفیات بھی کچھ بدل جاتی ہیں۔ اس لیے رسالہ کا تفصیلی مطالعہ تا حال نہیں ہو سکا۔ جتنا جتنا پڑھا ہے۔

نسیم سحر صاحب نے اپنے مکتوب میں ذکر کیا ہے کہ جولائی کے شمارے میں کسی مراسلہ نگار نے ان کی نعت اور غزل پر تبصرہ نہیں کیا۔ جب کہ وہ ہر اچھے شعر اور نثری تحریر کی تعریف کیا کرتے ہیں۔ اور اس سے متعلق والے کا بدلہ نہیں ہوتا کہ ان کی تحریروں کی بھی تعریف کی جائے۔ یہ تو وہی بات ہے کہ "بات کہنی بھی نہیں، بات چھپانی بھی نہیں"۔ نسیم سحر صاحب نے بین السطور مراسلہ نگاروں سے بے توجہی کا شکوہ ہی کیا ہے۔ میں نسیم سحر صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ میرے ادبی دوستوں میں سے ہیں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ صلے اور ستائش کی پرواہ کیے بغیر بے تکان لکھ رہے ہیں اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مجھے ان کا کوئی شعر اچھا لگے تو اس کا ذکر ضرور کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے انھیں میرا شمار ان مراسلہ نگاروں میں نہیں کرنا چاہیے جو ان کی تحریریں سرسری نظر سے پڑھتے ہیں اور تعریف کے ضمن میں بخل سے کام لیتے ہیں۔

دردانہ نوشین خان نے افسانہ نویسی کے ساتھ ساتھ نظم کے میدان میں بھی قدم رکھا ہے۔ ان کی نظم "پہاڑ سے کا رنگ ..... زندگی" اگرچہ نثری نظم تھی اور میں نثری نظم کا قائل نہیں ہوں۔ مگر دردانہ صاحبہ کی اس نظم میں نثر کی سطح پر فن کارانہ اسلوب نے بہت لطف دیا۔ معنوی سطح پر نظم زندگی کی یکسانیت کی نقش بند ہے۔

غزلوں میں سلطان سکون، آصف ثاقب، جلیل عالی، نسیم سحر، محسن اسرار، سعد اللہ شاہ، ہیثم نقوی، واصد سراج، راحت سرحدی، وسیم ہجران اور عطا الحسن کی غزلیں بہت اچھی لگیں۔ اس مرتبہ رسالہ میں واصد سراج کو دیکھ کر مسرت ہوئی۔ واصد سراج مصروف آدمی ہیں۔ کم کم لکھتے ہیں۔ مگر خوب لکھتے ہیں۔ شکر ہے بے پناہ مصروفیت کے باوجود انھوں نے طبعی شعری میدان کو زندہ رکھا ہوا ہے۔

رسالہ کا تفصیلی مطالعہ کیے بغیر مکتوب اس لیے ارسال کر رہا ہوں کہ اگلے شمارہ میں کہیں غیر حاضری نہ لگ جائے سو ایک غزل ارسال خدمت ہے اور شفقت حیات شفق صاحبہ کی غزل بھی ملفوف ہے۔ احباب بیاض کی خدمت میں میرا سلام۔

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

ماہ اگست کا شمارہ ملا۔ سبز پرچم کے رنگوں میں رنگا جشن آزادی کے حوالے سے وطن کی محبت سے مزین قطعہ حسب سابق حمدیہ اور نعتیہ کلام سے آغاز کیا گیا۔ خوبصورت غزلوں نظموں اور مضامین کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔

آغاز میں جناب خالد احمد کی نظم "لمحہ لمحہ" شامل کی گئی ہے جس میں حیرت اور روشنی کے حوالے سے قرب اور کمی کے پہلو کو اہمیت دی گئی ہے:

دور تک قرب کا اجالا ہے — طے تحیر کی وادیاں کر لے
ہاتھ میں کس نے ہاتھ ڈالا ہے — دور تک قرب کا اجالا ہے

محمد یٰسین قمر کا یہ شعر پسند آیا۔ رسول کریم کی رسالت کی انفرادیت کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان کو سوچا تو ہوا دل کا مدینہ خوشبو — جن کے آنے سے ہوا سارا زمانہ خوشبو

نسیم سحر نے سلام کے اشعار پیش کیے ہیں:

نصیب ہوئی تفہیم کربلا جب سے — یہ جاں حسین کی ہے اور یہ دم حسین کا ہے

ڈاکٹر نثار ترابی کا مضمون مشرف عشر صاحب کے سفرنامہ "ولایت چلتے ہیں" پر تنقید کرتا ہوا برطانیہ کے سفر کے حالات پر روشنی ڈالتا ہے۔

محمد علیم زبیر نے جون ایلیا کے درج ذیل شعر کو اپنی تنقید و تفہیم کا موضوع بنایا ہے:

کوچۂ زلفِ درازاں میں رچائیں گے جنوں
دشت و صحرا میں پھریں گے نہ پریشاں اب کے

غزل کے حوالے سے درج ذیل اشعار پسند آئے:

خلق و اخلاص و وفا، مہر و مروت کا چلن
نہیں جس شخص میں وہ میرے گھرانے کا نہیں — سلطان سکون

ہمیں افسوس ہیں تیرے لیے کچھ
ادھورے کام چھوڑے جا رہے ہیں — محسن اسرار

بزم میں باریاب تھا کل شب
ذرہ بھی آفتاب تھا کل شب — ناصر علی سید

دروازہ مرا ایک زمانے نے کھلا ہے
لیکن مرا گھر آپ کے آنے سے کھلا ہے — صفدر صدیق رضی

یہ اور بات کسی کو گماں نہیں ہوتا
جہان بھر کا ہوتا ہوں اکثر وہاں نہیں ہوتا — راحت سرحدی

بھر گیا رنگ مجھ میں برسوں پہلے ایک عشق
حسن سے چہرے کو پھر عاری نہیں ہونے دیا — رخشندہ نوید

رانا محمد شاہد

محترم مدیران عمران منظور، اعجاز رضوی

السلام علیکم!

یوم آزادی کی مناسبت سے سبز اور سفید رنگ کا سرورق دل کو بھایا، اس کے لیے یقیناً آپ کے ڈیزائنر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ''تعلق والی راہ'' سلیمان عبداللہ ذار کی تصوف کے دروا کرتی خوبصورت تحریر تھی۔ ڈاکٹر جہانت والا واقعہ پڑھتے ہوئے مجھے امام احمد بن حنبلؒ کا معروف واقعہ یاد آگیا کہ کیسے کسی کی دعا اور طلب نے نہیں مسجد سے گھسیٹ کر ان کے گھر تک پہنچایا۔ ثبات طلب اور تڑپ کی ہے کہ سعادت جن کے بخت میں لکھ دی جائے، رب کریم خود ہی ان کا تھ تھام لیتے ہیں۔ ماجد یزدانی کا شعری کینوس، جاذب نظر تشکیل اور نئی دانم معتبر شاعرہ منصورہ احمد کی ممتاز شخصیت بھی اچھے مضامین تھے۔ سمیرا کیونی کی تحریر ''انی'' پڑھ کر دل نم زدہ ہو گیا۔ تحریر پڑھتے ہوئے اپنی والدہ بہت یاد آئیں۔ مائیں تو سبھی سانجھی ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ امی محلے میں کسی کے انتقال پر تعزیت کے لیے گئیں۔ واپس آ کر بتایا کہ بہت رونا آیا تو بڑی ہمشیرہ نے پوچھا امی آپ کسی کے انتقال پر رو کیسے لیتی ہیں تو انھوں نے کہا ان کے دکھ کو دیکھ کر اپنے یاد آ جاتے ہیں، جو اس دنیا سے چلے گئے۔ ان کی تحریر کا یہ جملہ ''دوائی کھانے لگی ہوں، یہ دوائی ہے'' آنکھیں بھگو گیا۔ ماں سے بڑا دنیا میں کوئی نہیں، ماں سے بے لوث رشتہ دنیا میں کوئی نہیں۔ بقول شاعر:

سب نے اپنے اپنے تحفے بانٹ لیے
حال سفر کا میری ماں نے پوچھا تھا

فیصل زمان چشتی کی مشاعرے کی روایت اور سطحی شاعری کا رجحان دلچسپ اور معلوماتی مباحثہ تھا باقی لکھنے والوں نے اچھا لکھا اب غزلوں سے کچھ پسندیدہ اشعار:

وہ گلی ہم سے چھوٹتی ہی نہیں
کیا کریں، آس ٹوٹتی ہی نہیں — خالد احمد

نیند سی نیند ہے، تھکن سی تھکن
ایک پل ہے کہ بیتتی ہی نہیں

کیسے چھڑا کے ہاتھ وہ آگے چلا گیا
پھرتا ہے اب تلاش میں بچھڑا ہوا کوئی — آصف ثاقب

مجھ کو وضاحتوں کے لیے لفظ چاہیے
انجان بن گیا ہے جو سمجھا ہوا کوئی

ہم کتنے خوش گمان تھے اب جا کے یہ کھلا
گلدان میں تھے آپ کے سب کاغذی گلاب

قربان جائیں آپ کے اس اعتبار پر
اس جھوٹ کے تو سانسے سچ بھی ہے آپ آپ — سعد اللہ شاہ

اپنے ہی شہر میں پہچان نہیں ہے میری
اجنبی شخص کا کردار لیے پھرتا ہوں

لوگ اک اور زمانے کی خبر چاہتے ہیں
اور میں آج کا اخبار لیے پھرتا ہوں — اسحاق وردگ

میری طرف سے عام معافی ہے میرے یارا
تجھ کو حسد کی آگ ہی کافی ہے میرے یار

کچھ اور تم کو سمجھوں ضرورت نہیں رہی
بتنا سمجھ چکا ہوں وہ کافی ہے میرے یار — دانش عزیز

نہیں ملی مجھے منزل ابھی میں راہ میں ہوں
وہ روشنی میں ہے اور میں شب سیاہ میں ہوں

دیا فریب کسی کو مرے وسیلے سے
خبر نہ تھی کہ میں شامل ترے گناہ میں ہوں — شفقت حیات شفق

اُلفتِ نعت

مضرابِ نور
حمد و نعت

مصحفِ ثنا
محمد ظفر اقبال نوری

سجودِ قلم

يوم دفاع